گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی



اسکالر
شہنواز پروین

نگران
پروفیسر احمد قدوس جاوید

شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی سرینگر

فہرست

پیشِ لفظ

اردو کے عصری تنقیدی منظر نامے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام نامی سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ لسانی و ثقافتی، ادبی و معاشرتی روایات و اقدار، اجتہادات و افتراقات اور رجحانات و تحریکات کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ ادب اور ادیبوں کے جو تنقیدی جائزے پیش کرتے ہیں وہ یقیناً اُنہیں عصرِ حاضر کے تمام معتبر ناقدین میں سب سے ممتاز و منفرد ثابت کرتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مادری زبان نہیں۔ ان کی مادری زبان سرائیکی ہے۔ ان کی پیدائش بھی ایک غیر اردو علاقے "دکی (بلوچستان) میں ہوئی۔ دفتری اعتبار سے ان کی تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۳۱ء ہے۔ لیکن خود پروفیسر نارنگ اِسے اپنی مصدقہ تاریخ پیدائش

نہیں مانتے لیکن یہی تاریخ پیدائش اب ہر جگہ درج کی جاتی ہے۔ پروفیسر نارنگ ابتدائی عمر سے ہی اردو سے جذباتی اور تہذیبی طور پر اس طرح وابستہ ہوئے کہ پھر جیسے انہیں خود بھی یہ ماننے میں تکلف ہوتا ہے۔ کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے۔ حقیقتاً اردو ابتدا سے ہی اُن کی رگوں میں لہو کی طرح رواں دواں رہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بغیر کسی دعوی اور بغیر کسی صلہ کی پرواہ کئے اردو زبان وادب کی اتنی خدمت کی ہے کہ آج اگر بین الاقوامی سطح پر کسی کو اردو کے کسی عصری ادیب اور دانشور کی تلاش ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں بجا طور پر سب سے پہلے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہی نام آتا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شناخت ایک دیدہ ور نقاد کے طور پر قائم ہے۔ ان کے تنقیدی کارنامے کمیت کے اعتبار سے تو حیرت انگیز ہیں ہی کیفیت کے لحاظ سے اتنے معیاری، بصیرت افروز اور تاریخ ساز ہیں کہ ان کی بنیاد پر پروفیسر نارنگ کے تنقیدی مقام اور مرتبے کا تعین کرنے اور ان کے تنقیدی کارناموں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں اسکے لیے پروفیسر نارنگ جیسی

ہی علمیت، تجزیاتی شعور، اردو زبان و ادب سے عشق اور بین الموضوعاتی عرفان و آگہی کی ضرورت اور ظاہر ہے کہ مجھ جیسی حقیر طالبہ کے اندر اس کا شائبہ تک نہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری جیسے مشکل موضوع کا انتخاب کیا تو اسے میرا جنون ہی سمجھا جائے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ میں نے پروفیسر نارنگ کو پورے طور پر پڑھا اور سمجھا ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری سے بے حد متاثر بلکہ مرعوب رہی ہوں۔ پروفیسر نارنگ نے جس طرح اردو کی کلاسیکی نثری اصناف کی تہذیبی جڑوں اور ان کی شعریات کی باریکیوں کی دریافت کی ہے۔ جس پہلو سے اسلوبیات میر کا تجزیہ کیا ہے۔ میر انیس کے حقیقی مقام و مرتبہ کو قائم کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کی لسانی جہتوں کو منکشف کیا ہے اور امیر خسرو اور ولی سے لیکر فیض احمد فیض اور اس سے بھی آگے جدید ترین شاعروں تک کے شعری اور فنی نظام کا جس طرح تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے وہ اردو تنقید میں یقیناً "تازہ ہوا کے جھونکوں سے کم نہیں۔ مثنوی، مرثیہ، غزل، نظم کے علاوہ

نثری اصناف خصوصاً افسانہ اور ناول کے حوالے سے انہوں نے خاص طور پر راجندر سنگھ بیدی اور انتظار حسین کے فن کے حوالے سے جو تنقیدی مقالے قلمبند کئے ہیں وہ اردو کے تنقیدی سرمائے میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ہی ہیں جنہوں نے اردو میں وضاحت کے ساتھ سوسئیر کے نظریہ لسان، ساختیات، پس ساختیات ردتشکیل قاری اساس تنقید جیسے تصورات کو متعارف کروایا اور یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مشرقی شعریات، خصوصاً عربی، فارسی اور سنسکرت شعریات کے حوالے سے اردو میں نظریہ سازی کی اہمیت، ضرورت اور امکانات پر جس انداز میں روشنی ڈالی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اسی لیے کم از کم میں نے اتنا سمجھا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری۔ اردو میں تنقید کا ایسا معیار ہے جس تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا اور ایسا پیمانہ ہے۔ جو اردو کے علاوہ کسی بھی جدید ہندوستانی زبان کے ادب کے لیے میزان ثابت ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنے اس مقالے کو درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول۔ گوپی چند نارنگ۔ ایک تعارف

باب دوم ۔ گوپی چند نارنگ کی تصنیفات
باب سوم ۔ گوپی چند نارنگ اور لسانی و ادبی تحریکات و نظریات
باب چہارم ۔ گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری
باب پنجم ۔ گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری۔ معاصرین کے نقطہ نظر سے۔
باب ششم ۔ محاکمہ ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اہمیت، انفرادیت اور معنویت۔

میں نے اپنے اس مقالے کی تکمیل کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تمام تصنیفات حاصل کیں اور ان ابتدائی دور کے مقالوں کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جو ان کی کسی تصنیف میں شامل نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں لیکن کوشش بسیار کے باوجود بہت سارے مقالے مل نہیں سکے ۔ میرے نگراں پروفیسر قدوس جاوید، مشہور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر مجید مضمر اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر نذیر احمد ملک صاحب نے اپنی اپنی ذاتی لائبریریوں سے مجھے بعض رسائل اور کتابیں مہیا کروائیں جن کا تعلق میرے تحقیقی موضوع سے تھا۔ اسی طرح ماہنامہ "انشا" (کلکتہ)، کتاب نما (دہلی) اور بعض دیگر

ہندوستانی اور پاکستانی رسائل نے پروفیسر نارنگ کے حوالے سے جو نمبر اور گوشے شائع کئے ہیں انہیں بھی کسی نہ کسی طرح حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر نارنگ نے ادب کے نئے تصورات مثلاً مابعد جدیدیت ساختیات، پس ساختیات، تشکیلیت، رد تشکیلیت، نظریہ لسان، تفہیمیت (HERMENEUTICS) اور مظہریت۔ (PHENOMENOLO-GY) وغیرہ کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے انہیں سمجھنے کے لیے پروفیسر قدوس جاوید نے نہ صرف کتابیں اور اپنے مقالے فراہم کئے بلکہ ذاتی طور پر متعدد لیکچرز کے ذریعے انہیں سمجھانے اور میرے مقالے میں ان کے بارے میں وضاحت کرنے کی راہ بھی ہموار کی۔ اس ضمن میں ان کا جس حد تک بھی شکریہ ادا کروں کم ہوگا۔

اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے دوران جن اصحاب کی شفقت مجھے میسر رہی ان میں اولاً میں اپنے نگران پروفیسر احمد قدوس جاوید صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنی سعادت سمجھوں گی۔ ان کا میرے تئیں جو ہمدردانہ، پدرانہ اور مشفقانہ رویہ دوران تحقیق رہا اس کے لیے میرا قلم قاصر اور میری زبان عاجز ہے۔ میں شعبۂ اردو کے حالیہ صدر پروفیسر نذیر احمد ملک

پروفیسر مجید مضمر، پروفیسر محبوبہ وانی، پروفیسر سجان کور، ڈاکٹر فرید پربتی ڈاکٹر منصور احمد اور ڈاکٹر عارفہ بشریٰ صاحبہ کے تئیں اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ ان تمام خواتین و حضرات نے میری وقتاً فوقتاً اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے باوجود معاونت کی۔ میں وادی کے نامور اقبال شناس اور ممتاز دانشور پروفیسر بشیر احمد نحوی کا شکریہ ادا کرنا اپنی خوش بختی سمجھتی ہوں جنہوں نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود لبا اوقات میرے لیے وقت نکالا اور میری تحقیق میں آسانیاں پیدا کیں۔ علاوہ ازیں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اقبال انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ڈاکٹر تسکینہ فاضل صاحبہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں۔ موصوفہ نے قدم قدم پر میری معاونت کی۔ میں شعبۂ اردو کے غیر تدریسی عملے کی بھی نہایت ممنون ہوں خصوصاً محترم شوکت عباس صاحب، الطاف صاحب، فیاض صاحب، محترمہ رحمت النسا، محترمہ زاہدہ جی جنہوں نے مجھے کسی بھی دفتری طوالت میں پڑنے سے بعض رکھا۔ میں محترم عبداللہ خاور، گورنمنٹ ڈگری کالج پلوامہ کے صدر شعبہ ڈاکٹر نذیر احمد آزاد کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے گاہے گاہے میرے متعلقہ مواد کی نشاندہی کر کے میرے تحقیقی کام میں آسانیاں پیدا کیں۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی میں فاصلاتی شعبہ تعلیم کی ڈائریکٹر پروفیسر شفیقہ پروین اور اپنی دوست ڈاکٹر شبینہ پروین کی محبتوں کا ذکر نہ کرنا بدذوقی ہوگی۔

ان تمام اصحاب علم وفن کے علاوہ میں اپنے والدین محترمہ و محترم سید سراج الدین قادری سمیت اپنے برادران سید جاوید قادری اور سید ریاض قادری کی ممنون ہوں کہ انہوں نے دوران تحقیق میری ہر ضرورت کو بحسن و خوبی نبھایا۔ ان کے ساتھ ساتھ میں اپنے والدین یعنی محترمہ و محترم سید بشیر احمد رفیقی صاحب کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے میری تحقیق کے آخری مرحلے میں مجھے ہر طرح کی ذہنی معاونت کی۔ ان تمام رفقاء کے بعد میں اپنی اس حقیر کوشش کو اپنے رفیق حیات سید جاوید رفیقی سے منسوب کرتی ہوں۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے سامنے الفاظ پھیکے پڑ جاتے ہیں ان کی معاونت ہمیشہ میرے ہمرکاب رہی۔

میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتی کہ میں نے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے لیکن میں اپنے کام سے مطمئن ہوں اور اگر میری اس کوشش کو قبول کیا گیا اور ہمت افزائی کی گئی تو میں یہ سمجھوں گی کہ نامساعد حالات کے باوجود میں نے جو محنت کی ہے وہ رائیگاں نہیں گئی۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف

طالب دعا

شہناز پروین (سیدہ شہناز)

ریسرچ اسکالر پی، ایچ، ڈی

شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

باب اول

گوپی چند نارنگ ـــــ ایک تعارف

گوپی چند نارنگ صرف ایک شخصیت کا نہیں، اردو میں دانشوری کی نادر مثال، اردو تنقید کی معراج اور اردو شعر و ادب میں تازہ ترین افکار و نظریات کے معمار کا بھی نام ہے۔ پروفیسر نارنگ کو "ذات میں انجمن" کہنا۔ ان کا قد چھوٹا کرنے کے مترادف ہوگا۔ عملاً وہ انجمن ساز ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے متعدد ممالک میں اردو کی ادبی انجمنیں انہیں کی دلچسپیوں اور کوششوں کے سبب فعال ہیں اور اردو شعر و ادب کا ایک عالمی منظر نامہ ترتیب دے رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مشرقی اور مغربی ممالک میں اردو کے نام پر جو بھی سرگرمیاں دیکھنے میں آتی ہیں ان سب کے پس پشت بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کوششیں اور دعائیں ضرور شامل رہتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مادری زبان نہیں ہے۔ بلوچستان کے ایک مقام "دکی" میں پیدا ہونے والے گوپی چند نارنگ کی مادری زبان "سرائیکی" ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے خود لکھا ہے۔

"اردو میری مادری زبان نہیں۔ میری ددھیال اور ننھیال میں سرائیکی بولی جاتی تھی۔ میری ماں دہلی، ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی نرم اور رسیلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹا دیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری وساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی۔ یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے۔ میں اردو کو زبانوں کا "تاج محل" کہتا ہوں اور اکثر اس لذت کو اپنے خون کی روانی میں سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے خبر و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لئے

رازدل بھرا البتہ ہے۔ کیسے ہند آریائی کے بستے میں عربی، فارسی، ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک رنگا رنگ دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول و عرض میں وہ آج "لنگوا فرینکا" بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی جس کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔"

[دیباچہ۔ اردو زبان ولسانیات
از پروفیسر گوپی چند نارنگ ص۱۲]

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اردو زبان و ادب کے ساتھ والہانہ وابستگی کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کی شخصیت بھی برصغیر کی رنگا رنگ گنگا جمنی تہذیب کی علامت بن چکی ہے۔ اردو کسی خاص مذہبی فرقے کی زبان نہیں۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایسی شخصیتوں کی ایک طویل فہرست نظر آئے گی جن کا اردو زبان و ادب سے تعلق مذہبی اسباب کے بجائے ثقافتی اسباب کی بنا پر رہا ہے۔ اردو کی پیدائش ہی مختلف زبانوں، تہذیبوں اور رسوم و رواج کے باہمی میل جول سے ہوئی ہے۔ اسی لئے اردو زبان کے کردار میں لسانی اور جمالیاتی ہی نہیں ثقافتی اعتبار

سے بھی تکثیریت ملتی ہے اور اگر اردو کی تہذیب کی بات کریں تو یقینی طور پر اردو تہذیب برصغیر کی حقیقی تہذیبی تکثیریت (CULTURAL PLURALISM) کی علامت ہے۔ چنانچہ اردو زبان کو صرف اور صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اسے تعصب اور فرقہ وارانہ منافرت کی بھینٹ چڑھانے کی سازش کرنے والوں کے لئے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یہ جملے تازیانے کا حکم رکھتے ہیں کہ

"اردو کا ایک نام "سیکولرازم" یعنی غیر فرقہ واریت اور بقائے باہم بھی ہے اردو نے صدیوں سے اس کی معنی خیز مثال قائم کی ہے اور ہر طرح کی تنگ نظری اور دقیانوسیت کے خلاف محاذ باندھا ہے۔ لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ کیا کسی ایسے انسانیت پرور تصور کے بغیر ہمارے آزاد جمہوری معاشرے نہ صرف یہ کہ اپنے ترقی پذیر ہونے کا جواز فراہم کر سکتے ہیں بلکہ کیا کسی کشادہ اور روادار تہذیبی تصور کے بغیر زندہ بھی رہ سکتے ہیں؟"

(گوپی چند نارنگ۔ دیباچہ۔ اردو زبان اور لسانیات: ص-۱۲)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خاندان اصلاً مغربی پنجاب میں "لیہ" مظفر گڑھ کا ہے اور ان کے پرکھے وہاں صدیوں سے آباد تھے۔ ان کی گوتر "کشیپ" ہے جو درن کے اعتبار سے کھتری ہوتے ہیں۔ ان کے دادا شری چمن لال نارنگ زراعت پیشہ تھے۔ ننہال بھی زراعت پیشہ تھی۔ پروفیسر نارنگ کے والد بلوچستان میں ریونیو افسر مقرر ہوئے اور پھر وہیں بس گئے۔ بلوچستان کی ہی ایک تحصیل "دکی" میں گوپی چند نارنگ کی پیدائش ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں خود پروفیسر نارنگ نے لکھا ہے کہ "مجھے نہیں معلوم کہ میں کب پیدا ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ چوتھے درجے میں جب نئے اسکول میں داخل ہوا تو نیا فارم بھرنے کی ضرورت پیش آئی۔ والد صاحب نے تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۳۱ لکھوادی۔ نوروز کا نوروز، سالگرہ کی سالگرہ۔ اس دن سے یہی تاریخ پیدائش چلی آتی ہے۔ پروفیسر نارنگ کے مطابق ان کی پیدائش کے ڈیڑھ سال بعد والد صاحب موسیٰ خیل آگئے۔ نارنگ صاحب کے بچپن کا ایک حصہ اسی موسیٰ خیل میں گذرا۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے بچپن کے موسیٰ خیل کے دھندلے نقوش کو بڑے خوبصورت انداز میں اُتارا ہے "مکانوں کے پیچھے بڑا سا باغیچہ جس میں انار، ناشپاتی اور شفتالو کے درخت اور انگور کی بیلیں تھیں چاروں

طرف چھوٹے بڑے پہاڑ، مختصر سا بازار جس میں ڈاک کی لاری رُکا کرتی تھی۔
سب بچے اسی میں چڑھ جاتے اور ڈاک گھر سے بازار تک کی سیر کرتے۔ مغرب
میں پتھریلی سڑک تھی جو فورٹ سنڈے من کو جاتی تھی اِسی کے راستے میں ندی
پر وہ پل تھا جس کے نیچے گہرے نیلے پانی میں ہم کنکر پھینکتے تو مچھلیوں کے
سنہرے پر چمکنے لگتے۔ موسیٰ خیل سے پرائمری کرنے کے بعد گوپی چند نارنگ
"لیہ" مظفر گڑھ چلے آئے اور وہاں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ بیچ
میں دو تین سال کوئٹہ کے پشین میں بھی زیرِ تعلیم رہے لیکن ہائی اسکول کا
امتحان لیہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے ہی پاس کیا۔ نارنگ صاحب ایک
ذہین طالب علم تھے اور اکثر کلاس میں اول آتے تھے ہائی اسکول کے بعد
پہلے پہل وہ منڈے من کالج کوئٹہ میں داخلہ کے لئے پہنچے جہاں اچھے نمبرات
کی وجہ سے فیس تو معاف ہوگئی لیکن وظیفہ نہیں ملا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ تو وظیفہ
نہ ملنے کی وجہ سے اور کچھ والد صاحب کی بنا پر لائل پور زراعتی کالج
کا رُخ کیا لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں داخلے کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔
یہ زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ سیاسی خلفشار، فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائیاں۔ ہجرتوں کا
لامتناہی سلسلہ۔ گوپی چند نارنگ انہیں حالات میں دہلی چلے آئے۔ نارنگ صاحب

دہلی میں تنہا تھے۔ گھر والے پشاور میں۔ تقسیم ملک نے پروفیسر نارنگ اور ان کے گھر والوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی۔ اس دوران نارنگ صاحب کو جینے کے لئے چکی کی مشقت کے تقاضے پورے کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ انہیں کچھ عرصہ کے لئے لیبر انسپکٹر کے طور پر بھی کام کرنا پڑا لیکن اس کڑے وقت میں بھی انہوں نے اپنی خود اعتمادی، حوصلہ اور ذوق و شوق کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہیں حالات میں اجمیر بورڈ سے ایف اے اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ تین چار برسوں پر مشتمل وقت کا یہ ٹکڑا کتنا آتشیں کتنا دکھ بھرا رہا ہوگا۔ اس کا صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے حالات زندگی اور خاندانی پس منظر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن تقسیم ملک کے سانحہ کے آس پاس کے برسوں میں ان پر، ان کے خاندان پر اور اس امن پسند سرزمین کے عام لوگوں پر جو کچھ بھی گذری اور یہ سب دیکھ کر اور جھیل کر خود نارنگ صاحب کے دل پر کیا گذری ہوگی اس کا ذکر بھی کرنے سے وہ ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ یہ ان کی وضع داری اور شرافت کا تقاضہ تھا۔ لیکن اس عرصہ میں اپنے دل کی لگی کی جانب اشارہ کرنے سے پرہیز نہیں کیا ہے۔ کالج کے دنوں میں ہی "والدین ایک جگہ رشتہ ٹھہرا چکے تھے کہ ایک لڑکی سے

شناسائی ہوئی۔ تقریباً آنا جانا اور اُٹھنا بیٹھنا شروع ہوا۔ اور جب ایک آدھ بندش بھی عائد ہوگئی تو زندگی ہیروکی پیروڈی سی ہوکر رہ گئی بہر حال پرانا رشتہ منسوخ اور نیا مقرر ہوا۔ انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۵۴ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ اور وہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کے لئے ان کا موضوع "اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ" تھا۔ اپنے اس مقالے کی بنیاد پر پروفیسر گوپی چند نارنگ تین ضخیم کتابیں منظر عام پر لا چکے ہیں۔

۱۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں"

۲۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب"۔ اور تیسری کتاب کا عنوان "ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری" ہے۔ یہ تینوں کتابیں مل کر پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بھی اپنی علم کی پیاس بجھنے نہیں دی اور پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں آنرز کی ڈگری حاصل کی، دہلی یونیورسٹی سے لسانیات میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کیا اور انڈیانا یونیورسٹی سے سمعیات اور تشکیلی گرامر پر خصوصی کورس کیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ باضابطہ طور پر درس و تدریس سے ۱۹۵۸ء میں

والبستہ ہوئے جب وہ باقاعدہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر مقرر ہوئے اس سے پہلے تھوڑے عرصے کے لئے انہوں نے سینٹ اسٹیفن کالج میں جزوقتی لیکچرر کے طور پر بھی کام کیا۔ ۱۹۶۱ء میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ہی ریڈر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ اسی دوران کامن ویلتھ فیلوشپ بھی ملا ان کی غیر معمولی خدمات کے پیش نظر انہیں سوویت روس میں ملازمت کی پیش کش بھی ہوئی لیکن انہوں نے بعض وجوہات کی بنا پر منظور نہیں کیا۔ لیکن جب وسکانسن یونیورسٹی نے انہیں وزٹنگ پروفیسر   کی پیش کش کی تو انہوں نے اسے قبول کرلیا اور ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک کا زمانہ انہوں نے وسکانسن یونیورسٹی اور مینی سوٹا میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے گزارا یہ پورا عرصہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے درس و تدریس، مطالعہ اور تحقیق و تنقید میں گزارا۔ وسکانسن میں اپنے قیام کے دوران پروفیسر نارنگ نے اپنی لسانیات کی تربیت مکمل کی۔ ۱۹۷۰ء میں وسکانسن سے واپس آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تقرری بحیثیت پروفیسر اردو جامعہ ملیہ دہلی میں ہوگئی جہاں انہوں نے بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ اردو وہ   تک نہ صرف درس و تدریس سے وابستہ رہے بلکہ اس وقت جامعہ ملیہ کا شعبہ اردو جس عمارت میں واقع ہے۔

پروفیسر مظفر حنفی کے مطابق اس کی زمین بھی پروفیسر نارنگ نے خود ہی اپنی کوششوں سے بہت معمولی قیمت پر خریدوائی اور اپنی نگرانی میں ہی نہ صرف عمارت بنوائی بلکہ الماری میز کرسیاں وغیرہ بھی خود ہی تیار کروائیں۔ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی ادبی سرگرمیاں کم نہیں ہوئیں اسکا ثبوت ان کی وہ کتابیں ہیں جو ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد شایع ہوئیں۔ پروفیسر نارنگ نے ایک عرصہ تک قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی کے چیرمین کی حیثیت سے جو بیش بہا خدمات انجام دیں ان کی بنا پر انہیں پہلے پدم شری اور پھر پدم بھوشن جیسے اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے وہ ساہتیہ اکادمی کے صدر کے عہدے پر فائز ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ دیگر ہندوستانی زبانوں اور ادب کے فروغ کے ضمن میں اہم کارنامے انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر نارنگ کو اب تک ہندوستان، پاکستان، امریکہ کناڈا اور سعودی عرب میں اتنے انعامات اور اعزازات سے نوازا جا چکا ہے کہ ان کا شمار بھی اب مشکل ہے۔ پاکستان کے ادیبوں کے ساتھ ہندوستانی ادیبوں کے رشتے استوار کرنے بلکہ ہند پاک دوستی کی راہ ہموار کرنے میں بھی پروفیسر نارنگ

کا اہم کردار رہا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اردو کی کوئی بستی ایسی نہیں ہے جہاں کا انہوں نے دورہ نہ کیا ہو۔ بلکہ انہوں نے اردو کی نئی بستیوں کی لسانی اور ادبی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانے کے معاملے میں جو سنجیدہ کوششیں کی ہیں ان کی گواہ ان کی تازہ ترین تصنیف "اردو کی نئی بستیاں" ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج پروفیسر گوپی چند نارنگ، اردو دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ جن کے لئے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ازدواجی زندگی قدرے اتار چڑھاو کی شکار رہی، اس کے بارے میں خود انہوں نے ہی کہا ہے "میری دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیگم کا نام شریمتی تارا نارنگ ہے۔ وسکانسن سے لوٹنے کے بعد ان سے طلاق ہو گئی۔ تارا جی ہمارے بڑے بیٹے ڈاکٹر اَرون نارنگ کے ساتھ ٹورنٹو میں رہتی ہیں۔ ڈاکٹر ارون ٹورنٹو کناڈا میں دانتوں کا ماہر سرجن ہے۔ میری دوسری شادی دہلی میں بہت بعد میں ہوئی۔ بیگم کا نام شریمتی منورما نارنگ ہے چھوٹے بیٹے ترون کی زیادہ تر تعلیم دہلی میں ہوئی اور ڈاکٹری کی تعلیم اس نے کرناٹک جا کر حاصل کی۔ اب ڈاکٹر ترون نارنگ نیویارک کے لنکن میڈیکل سنٹر

میں ریزیڈنٹ ڈاکٹر ہے۔ بڑے بیٹے کی دو اولادیں ہیں ایک لڑکا اور لڑکی پوتے کا نام رشی اور پوتی کا نام شفالی ہے۔ یہ بچے دونوں کینیڈا میں زیر تعلیم ہیں۔ ترون کی شادی ۲۰۰۳ء میں دہلی میں ہوئی اور اب بہو بیٹا دونوں نیویارک میں ہیں۔ میں نہ نیویارک میں رہنا پسند کرتا ہوں نہ کینیڈا میں۔ میرا مستقر دہلی ہے۔ یہ مختصر سا خاندان گویا اب براعظموں میں بٹ گیا ہے۔"

ایک پرانی لیکن بڑی سچی کہاوت ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ کئی اعتبار سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ہمہ جہت کامیابی اور کامرانی میں ان کی بیگم محترمہ منورما نارنگ کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ دراصل شخص جتنا بھی عظیم اور منفرد کیوں نہ ہو بحیثیت آدمی اس کو عورت ہی گہرائی سے سمجھ پاتی ہے۔ محترمہ منورما نارنگ صاحبہ نے بھی پروفیسر نارنگ کو ہر ہر پہلو سے سمجھ کر زندگی کے ہر موڑ پر ایک مثالی ہندوستانی عورت (پتنی) کی طرح ان کا ساتھ دیا ہے۔ محترمہ منورما جی' پروفیسر نارنگ کی مزاج شناس ہیں۔ نارنگ صاحب کی حد درجہ مصروفیتوں کے سبب انہیں کبھی شکایت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ہمیشہ یہی سوچتی ہیں کہ "کاش میں نارنگ صاحب کی ادبی مصروفیتوں میں ان کی معاونت کر پاتی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کی شخصیت کے بارے میں محترمہ منور ماجی فرماتی ہیں۔

"آدمی جو کچھ ہے اپنی سوچ، عادتوں، عقیدوں، امنگوں، خوابوں اور حوصلوں سے ہے۔ جن کو سمجھنے میں وقت لگ سکتا ہے لیکن نارنگ صاحب شفاف آدمی ہیں۔ ان کے کردار و گفتار میں فرق نہیں۔ وہ جو دوسروں سے توقع کرتے ہیں پہلے خود ان توقعات پر کھرا اُترنا چاہتے ہیں۔ لگتا ہے نارنگ صاحب کا خمیر محبت اور انسانیت سے گوندھا گیا ہے۔ کوئی بھی چاہے تو ان کی انسانیت، نیکی، شرافت، خودداری، ایثار اور جذبہ خدمت سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔" [1]

محترمہ منور ماجی نے مختصر الفاظ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شخصیت کے جن پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے ان کی تصدیق پروفیسر نارنگ کے ہم عصر ناقدین ادیبوں اور دانشوروں نے بھی کی ہے مثلاً

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے۔

"پروفیسر نارنگ کے کام اور نام سے ہم سب برسوں سے

---

[1] "انشاء" کا گوپی چند نارنگ نمبر (مرتبہ) ف۔س۔ اعجاز ص ۶۹

واقف ہیں ..... وہ اپنے کام کی طرح ایک زندہ ملنسار
اور اچھے انسان بھی ہیں۔"

دیدہ ور نقاد ص ۳۴

۲۔ مجتبیٰ حسین کا ایمان ہے۔

"اردو کے معتبر نقاد، صاحب طرز ادیب مایہ ناز محقق، جادو بیان
مقرر، بلند پایہ ماہر لسانیات اور ان سب سے بڑھ کر ایک
اچھے دوست اور انسان کی حیثیت سے میں پروفیسر نارنگ
کی عزت کرتا ہوں۔"

۳۔ احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں۔

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو قدرت کی طرف سے جو حیرت انگیز
قوتِ کار ودیعت ہوئی ہے اور اس توانائی سے وہ علم و ادب
کے جو کارنامے انجام دے رہے ہیں ان پر محققین اور ناقدین
کو رشک کرنا چاہیئے ..... ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے
سے محقق و ناقد کو دیکھ کر یہ سہارا ملتا ہے کہ اعلیٰ معیاروں کو
اپنی منزل قرار دینے والے اہل علم برصغیر میں ابھی موجود ہیں۔"

دیدہ ور نقاد۔ ص ۲۶

نظیر صدیقی نے کہا ہے۔

"برصغیر ہندوستان و پاکستان میں بہت کم لوگ ہی ایسے ہیں جو دانشورانہ غور و فکر کے لئے دقتوں اور مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ ان میں سے ایک ہیں جو حالات کے جبر کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کا انہوں نے پورا استعمال کیا ہے۔"

پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی کہتے ہیں۔

"نارنگ صاحب ہمارے ان سر برآوردہ ادیبوں اور دانشوروں میں ہیں جو گزشتہ تقریباً نصف صدی سے مسلسل اور لگاتار علم و ہنر کے لئے افق کی جستجو اور فضل و کمال کی روایت کو پروان چڑھانے میں اس طرح مستغرق اور سرگرم ہیں کہ ان کی پوری زندگی ایک اضطراب آسا اور بے قرار روح کے سفر کی داستان بن گئی ہے۔

انشاء صفحہ ۸۰

محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کی نظر میں۔

"اردو کا ادبی اور لسانی خزانہ قارون کے خزانے سے کم نہیں ہے اور یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ ان نادر جواہرات کے پارکھ ہر دور میں اچھے سے اچھے ملے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی بحیثیت ایک جواہر شناس محتاج تعارف نہیں ہیں۔ یورپ میں صاحب نظر افراد کو RENAISSANCE MEN کہا جاتا ہے۔ پروفیسر نارنگ بھی ہمارے نشاۃ ثانیہ کے ممتاز نمائندہ ہیں۔"

انشاء۔ ص ۷۹

اردو کے نفیس ترین شاعر مظہر امام نے پروفیسر نارنگ کی شخصیت کے بارے میں یہ جملے لکھے ہیں۔

"گوپی چند نارنگ سے میری پہلی ملاقات مختصر تھی لیکن ان کی گرم جوشی ذہانت اور نفاست نے ایسے نقوش چھوڑے کہ ان کا تاثر آج بھی قائم ہے۔ خوش رو، خوش مزاج، خوش لباس، خوش بیان، یہ خصوصیات کسی کو بھی متاثر کر سکتی ہیں اور یہیں تو ان صفات سے عاری اشخاص سے قریب آنے میں

ہمیشہ تکلف محسوس کرتا ہوں۔"

انشاء صفحہ ۱۱۶

عبدالصمد کا مشاہدہ ہے کہ

"گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونے کا ظرف جو گوپی چند نارنگ کو حاصل ہے شاید کسی اور کو حاصل نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اس سے خوب خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے وہ جواب دینے یا دوسروں سے کرنے یا کروانے کی جگہ ہمیشہ ایک نئے عزم و ہمت کے ساتھ اپنے اگلے پروجیکٹ میں جٹ جاتے ہیں۔ اور پھر جلد ہی ان کا نیا کارنامہ منظر عام پر بھی آجاتا ہے۔

انشاء۔ صفحہ ۱۳۰

پروفیسر مظفر حنفی نے پروفیسر نارنگ کی شخصیت کے بارے میں محسوس کیا ہے کہ

"قدرت نے پروفیسر نارنگ کو بعض ایسی خوبیاں عطا کی ہیں جو دوسرے اشخاص میں کم پائی جاتی ہیں۔ مثلاً وہ جامہ زیب خوبرو، وجیہہ، خلاق، خوش اطوار، خوش اخلاق اور خوش گفتار

اور شیریں مقال تو ہیں ہی کچھ اتنے کہ " وہ کہیں اور سنا کرے کوئی ۔ انہیں کچھ ایسی مہارت حاصل ہے کہ یونیورسٹی کے عہدہ داران سے لے کر مرکزی حکومت کے بڑے سے بڑے افسر اور وزراء تک نہ صرف رسائی رکھتے ہیں بلکہ اپنے مطالبات اور بات اس خوبی سے پہنچاتے ہیں کہ ان کے مطالبات کو رد کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ہوتا"۔

انشا صفحہ ۱۳۸

کنٹر ادیب ڈاکٹر ھا - ما - نائک کے مطابق ۔

" ڈاکٹر گوپی چند نارنگ..... نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دیگر ملکوں میں بھی آج جانی پہچانی شخصیت ہیں وہ ایک مشہور و معروف اردو عالم ہیں نقاد بھی، محقق بھی اور ماہر لسانیات بھی..... سیاسی وجوہ کی خاطر اردو زبان و ادب کا استحصال کرنے والوں سے ان کی نہیں پٹتی ۔ ایسے موقعوں پر وہ شمشیر برہنہ ہو جاتے ہیں اور کھل کر بولتے ہیں"۔

انشاء صفحہ ۱۴۵

احمد سعید ملیح آبادی کی نظروں میں

"پروفیسر گوپی چند نارنگ ...... ایک بے مثال مقرر بھی
ہیں..... بولتے ہیں تو لگتا ہے کہ منہ سے پھول جھڑ رہے
ہیں جن سے سننے والوں کے دل ودماغ معطر ہو جاتے
ہیں۔ صاف سلیس شستہ پیرایہ' بات دلیل اور وزن کے
ساتھ۔ دلیل بھی ایسی جو چبھے نہیں دل کو لگے۔ جنہوں نے
نارنگ کو صرف پڑھا ہے' سنا نہیں، وہ ان کی تقریر
کی لذت نہیں جانتے۔ زبان وادب کے ہر گوشے اور پہلو
پر وہ بے تکان اور مدلل بولتے ہیں اور سننے والے کان
دھر کے سنتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے خطبوں
سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔"

انشا ص ۱۴۸

مایہ ناز ترقی پسند ادیب اور دانشور پروفیسر قمر رئیس نے پروفیسر نارنگ کی شخصیت کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھا ہے ان کے مطابق۔

"اس سچائی کی طرف لوگ بہت کم دھیان دیتے ہیں کہ

۱۹۵۰ء کے بعد جب انہوں نے اُردو زبان وادب میں
ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کا فیصلہ کیا اس وقت اس ملک
میں اردو کے فروغ کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ وہ
ایک معتوب زبان تھی۔۔۔۔۔اسی زبان کی انمول خدمات
کے سلسلے میں اسے منصب جلیل مل سکا۔

ان ش ص ۱۶۳

ہندی کے مشہور فکشن نگار اور دانشور کملیشور نے ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کی علامت اردو کے خلاف ریشہ دوانیوں کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کی مجاہدانہ خدمات پر روشنی ڈال کر ان کی شخصیت کو تاریخ کے جھروکوں سے دیکھا ہے۔

"اس ماحول کو یاد کیجئے۔ جب ہندو فرقہ پرستوں اور ہندوتو
وادیوں کے ذریعے اردو کو ملک دشمن مخبروں کی زبان کا درجہ
دے دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ تب اردو زبان اور اردو ادب کی
تخلیقیت اور قومیت سے بھرپور آواز کو ہمارے دور میں
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ہی بلند کیا ہے۔ کسی سیاسی اسٹیج
سے نہیں ادب کے اپنے تخلیقی اسٹیج کی سچائیوں اور دلیلوں

کی طاقت سے۔ کیونکہ لکھے ہوئے لفظ کی گواہی کو توڑا مروڑا نہیں جا سکتا۔ تو یہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نام کا شخص ایک عجیب شخص ہے جسے خود نہیں معلوم کہ اس نے اپنا منفرد ادبی کارنامہ انجام دیتے ہوئے اردو اور ہندوستانی قومی فکر اور اس میں اردو کی حصہ داری کو پہچاننے اور سمجھنے کیلئے کتنی اہم اور ضروری بھومیکا تیار کی ہے۔

الشا صد ۱۷۶

مشہور اردو افسانہ نگار جوگندر پال نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شخصیت کو بہت قریب بہت گہرائی سے نچوڑ کر کہا ہے۔

"نارنگ ... جہاں آ پہنچے ہیں ..... ثابت قدمی سے سوچتے، سمجھتے، کرتے اور کہیں ٹھوکر لگنے پر سنبھلتے ہوئے آئے ہیں اور شاید انہیں یہاں بھی مستقل قیام نہیں کرنا ہے۔ اپنی ہر منزل سے انہیں کسی نئی منزل کا سراغ ملتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، ان کے تعلق سے ایسا کیونکر ممکن ہوتا رہا ہے؟ اپنی اس لمبی راہ میں تھک ہار کر انہوں نے کسی آرام دہ مقام پر ہتھیار ڈال کر

لمبی کیوں نہ تان لی ۔؟۔ معلوم ہوتا ہے ان کے سفر کے تواتر
کا سامان از خود اور بے تدبیر نہیں ہو پایا ہے ۔ اپنے مقصد کے
حصول کے لئے وہ اپنی زندگی کے ہر پڑاؤ پر اپنے مطمح نظر
میں موقع و محل کے چیلنج کے مطابق مناسب ترمیمات کرتے
رہے ہیں ۔ اس لئے ان کی پیش قدمی میں انحطاط واقع نہیں
ہوا ۔" الف شا صہ ۲۱۷

پروفیسر نارنگ کی شخصیت سے متعلق گزشتہ سطور میں بیان کی گئی تفصیلات اور ان کے ہم عصروں کے تاثرات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروفیسر نارنگ اردو زبان و ادب کی تاریخ کی ایک ایسی شخصیت ہے جن کا ثانی نہ ان سے پہلے کوئی نظر آتا ہے اور نہ بعد میں دور دور تک ان جیسی کوئی دوسری شخصیت نظر آتی ہے ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو زبان و ادب کا وہ روشن چراغ ہے جس نے تاریک راہوں میں امید کی جوت جگا کر اردو ادب کو ترقی کی راہوں پر گامزن کیا۔ نارنگ ادب و دانش کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں لیکن اس مقام تک پہنچ کر بھی ان کا ذہنی و فکری سفر برابر جاری و ساری ہے وہ کسی پڑاؤ کو منزل نہیں سمجھتے

وہ اردو کی فلاح و بہبود کے لئے عملی وادبی طور پر کوشاں رہتے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اردو زبان و ادب کے گیسو سنوارنے کا معاملہ در پیش ہوتا ہے پروفیسر نارنگ وہاں پہنچ کر اس زبان و ادب کے تئیں اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ نارنگ صاحب اردو کے بے لوث سپاہی گردانے جاتے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں نارنگ کی خدمات کا اعتراف بین الاقوامی سطح پر ہو چکا ہے۔ ہندو پاک کے علاوہ امریکہ میں بھی اردو زبان وادب پر جو تحقیقی کام آئے دن ہوتے رہتے ہیں ان میں بھی پروفیسر نارنگ کا ایک غیر معمولی کردار ہوتا ہے۔ ان کی اردو زبان وادب کی خدمت کو دیکھ کر حیرانی بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی، ناکامی و نامرادی اور تھکاوٹ و اکتاہٹ کا دخل انکی سرشت میں کہیں نظر نہیں آتا۔ جب دیکھو تازہ دم ہوکر نئی راہوں کے سفر کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید منظور احمد :

" پروفیسر نارنگ جتنا کام اردو زبان وادب کا کرتے ہیں اس کو دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی، تھکن اور ہار، ناکامی اور نامرادی ان کی سرشت میں داخل نہیں۔ جب دیکھو تازہ دم نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جیتا جاگتا

کمپیوٹر ہے۔" ع۱

گوپی چند نارنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کوئی محدود اور جامد نہیں بلکہ وسیع اور سیال زاویہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو روایت کے شہسوار ہیں تو دوسری طرف جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مرد میدان۔ جہاں انہوں نے روایتی ادب کا غائر مطالعہ کرکے اسے وسعت و کشادگی سے ہمکنار کیا وہیں وہ جدیدیت کے ایسے سرپرست رہے ہیں کہ اگر وہ ہندوستان میں شمس الرحمان فاروقی کے دوش بدوش نہ ہوتے تو جدیدیت کی اصطلاح ادب سے کب کی خارج ہو چکی ہوتی۔ غرض روایت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے خوبصورت سنگم کو نارنگ کے یہاں جس انفرادیت کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے اس کی مثال ناممکن ہے۔ نارنگ کی شخصیت میں ایک اور انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ گہرے اور وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کی بنا پر گھسی پٹی لکیروں سے ہٹ کر اپنے مطالعہ اور تجزیاتی قوتوں کو بروئے کار لاکر اپنے ہی دماغ سے سوچتے اپنی ہی قوتِ ذہن کو استعمال کرتے اور اپنے ہی دل سے محسوس کرتے ہیں اور اپنی ہی ذہانت و فراست سے پُر اعتماد فیصلے صادر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نارنگ صاحب

ع۱ گوپی چند نارنگ۔ حیات و خدمات از ڈاکٹر محمد حامد علی ص ۳۵۷

کی شخصیت میں بیک وقت ایک اعلیٰ درجہ ادیب، بلند پایہ محقق، کہنہ مشق نقاد، ایک ماہر لسانیات، ماہر سماجیات و ساختیات اور ماہر اسلوبیات و سمعیات وغیرہ کے بے شمار پہلو یکجا ہو گئے ہیں۔ جو ان کی شخصیت کو ادب کا ایک لافانی حصہ قرار دیتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق احمد ندیم قاسمی کے اس خیال سے ہوتی ہے۔

"ڈاکٹر نارنگ کی علمی سرگرمیوں کی نوعیت بے حد متنوع ہے۔ وہ بیک وقت ادبیات، لسانیات، سماجیات، اسلوبیات، ساختیات وغیرہ پر پوری قدرت سے حاوی ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دورِ حاضر کی تخلیقی سرگرمیوں اور جدیدیت کے زیرِ اثر لکھے جانے والے شعر و ادب کے بھی متوازن اور منصف مزاج تجزیہ نگار ہیں ..... بلاشبہ ڈاکٹر نارنگ کا شمار ان محققین و ناقدین میں ہوتا ہے جو عصر حاضر کے تخلیقی رویوں سے نہ صرف بیگانہ نہیں بلکہ ان کا ناگزیر حصہ ہیں۔" ؎۱

؎۱ کتاب نما کا خصوصی شمارہ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ: شخصیت اور ادبی خدمات (مرتبین) پروفیسر شہریار پروفیسر ابوالکلام قاسمی ص ۳۸۔

گوپی چند نارنگ کے امتیازات میں ایک خاص امتیاز ان کی سلیقہ مندی ہے وہ ہر بات کو سلیقے کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تحریروں کو بھی نہایت سلیقے اور قرینے سے رقم کرتے ہیں یوں اُن کی طرز تحریروں میں عمیق نظر، باریک بینی، خوش مذاقی، تجزیاتی داک جرأت فکر و اظہار ایک انفرادی قوت ودلیعت کر جاتی ہے جس کی شناخت آسانی سے کی جاسکتی ہے یہ انفرادیت ہر قلمکار کو نصیب نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تحریر میں حد درجہ جگر کاوی اور خونِ جگر کی آمیزش نہ ہو اور یہ صفت پروفیسر نارنگ کے رگ دپے میں ہے

پروفیسر نارنگ ایک تازہ کار کھُلا ذہن رکھتے ہیں وہ ذکی بھی ہیں اور روشن دماغ بھی۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں نہایت ہی مشقت کے ساتھ اسے تکمیل کو پہنچاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں متنوع ہوتی ہیں۔ ان کے کام میں خواہ وہ لسانیات یا اسلوبیات سے تعلق رکھتا ہو یا اساطیری یا دیومالا، کتھا کہانی فکشن یا فن شناسی فنکار شناسی سے یا ادبی تھیوریز سے اپنی جڑوں کی کھوج یا تہذیبی رشتوں کی بازیافت کہیں نمایاں تو کہیں پوشیدہ ہمیشہ ان کے ہمرکاب رہتی ہے اور ان کی ذہنی ترغیب کے لئے راہ نما کا کام

انجام دیتی رہی ہے اور اس میں پروفیسر نارنگ حد درجہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور ساتھ ہی تقویت انہیں اس امر سے بھی حاصل ہوئی ہے کہ نئی تھیوریز اور مابعد جدیدیت کی پیش قدمی کے بعد چونکہ تہذیبی جڑوں کے تفاعل اور مقام اور تمدنی و تہذیبی مطالعہ کو ادب شناسی میں مکمل طور پر مرکزیت حاصل ہو گئی ہے چنانچہ جس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے نارنگ نے نصف صدی پہلے شروع کیا تھا اسکی اہمیت اور معنویت میں آج مزید اضافہ ہو گیا۔ اسے پروفیسر نارنگ کے خوابوں کی تعبیر کہہ سکتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو میں تنقید و تحقیق، لسانیات، اسلوبیات اور اردو تحریک کی زندہ اور متحرک علامت کا نام ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو قدیم و جدید مختلف رجحانات، تحریکات اور نظریات کے حوالے سے دیکھا، سمجھا اور سمجھایا ہے۔ پروفیسر نارنگ کی ابتدائی کتابوں مثلاً "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں"، ہندوستانی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری" اور "اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب" نیز" ہندوستان کے اردو مصنفین اور اردو شعراء" سے لیکر" ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" ادبی تنقید اور اسلوبیات" اور ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت" اردو زبان و

لسانیات اور اردو کی نئی بستیاں تک کے مطالعے سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نارنگ نے ابتداء سے آج تک اردو میں نمایاں ہونے والے تمام رجحانات تحریکات اور نظریات کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے سماجی اور ثقافتی اقدار اور رویّوں پر گہری نظر رکھتے ہوئے اردو زبان و ادب کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ ان کی تنقید اردو ادب کی تمام تحریکات، علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک سے گذر کر جدیدیت اور مابعد جدیدیت تک پہنچی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے مغربی علوم کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے اور مغربی ادب کے لسانی ماہرین اور مفکرین کے افکار کو پرکھا ہے۔ نارنگ اپنی تحریروں بالخصوص ساختیات، پس ساختیات اور دیگر لسانی موضوعات کے مطالعہ میں ان مغربی مفکرین اور لسانی ماہرین کے تصورات و نظریات کو کام میں لاکر اردو زبان و ادب میں نئے اضافے کرنے میں سرگرداں رہے۔ پروفیسر نارنگ نے اردو میں نظریہ سازی کی طرف توجہ مبذول کرواکر ادبِ اردو میں گرالقدر خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے اپنی کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کے دیباچے میں ہی ادب میں نظریہ سازی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ ادب میں بنیادی تحریکیں تین ہیں: سرسید تحریک، ترقی پسند تحریک اور

اور جدیدیت کا رجحان۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان تینوں تحریکوں کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے ان کی قدر و قیمت کے بارے میں عالمانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان تحریکات کا ادب کے ہر تقاضے کے ہم رکاب رہنے کا اعتراف کیا ہے۔ ان تحریکوں کے بارے میں نارنگ یوں لکھتے ہیں:

> "اردو تین بڑی تحریکوں کے جزر و مد سے گزری، سرسید تحریک ترقی پسند تحریک اور جدیدیت۔ ان میں ہر تحریک اپنے عہد کے تقاضوں اور نئے فکری اثرات سے پیدا ہونے والی داخلی حرکیت کا نتیجہ تھی۔" [۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ سرسید تحریک کے اثرات کا تجزیہ دوسرے ناقدین سے ہٹ کر ایک الگ انداز میں کرتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ" میں سرسید تحریک کے بارے میں لکھا ہے۔

---

[۱] دیباچہ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات از گوپی چند نارنگ (بحوالہ انشا گوپی چند نارنگ نمبر مرتبہ ف، س اعجاز ص ۲۵۸)

"...... سرسید نے جب اپنا تعلیمی مشن شروع کیا تھا جس
کا حلقۂ اثر نصف صدی سے بھی زیادہ زمانے کو محیط ہے
تو تقریباً دو دہائیوں تک سرسید یا ان کے رفقاء میں سے کسی
نے اعادہ نہیں کیا کہ یہ کوئی ادبی تحریک بھی ہے۔ جتنی
تبدیلیاں بشمول حالی و آزاد کے جدید شاعری کے منشور
کے یا نذیر احمد کی ناول نگاری کے واقع ہوئیں۔ ان کو
سرسید تحریک کا نام بہت بعد کو تاریخ نے دیا اور تو
اور شبلی کے نظریاتی اختلافات سرسید سے کوئی ڈھکی
چھپی بات نہیں۔ لیکن شمار شبلی کا بھی سرسید تحریک میں
ہی کیا گیا۔" ع۱

لیکن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتابوں میں سرسید تحریک کے اصلاحی اور مقصدی عناصر سے بحث کرنے کے بجائے سرسید تحریک سے وابستہ ادیبوں اور دانشوروں کی خدمات کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے مثال کے طور پر پروفیسر نارنگ نے حالی کے تنقیدی شعور سے بحث کرتے ہوئے

ع۱ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ مرتبہ گوپی چند نارنگ (ص ۴۳-۴۴)

مشرقی شعریات کے حوالے سے حالی کی خدمات کو سراہا ہے۔ حالی کا مقام نارنگ اردو شعر و ادب میں نہایت معتبر پیرائے میں بیان کرتے ہیں :

"حالی نظم کے امام ہیں۔ ان سے اردو شعر و ادب میں ایک خاموش انقلاب کی ابتداء ہوتی ہے۔ انہوں نے زبان و بیان کے نئے سانچے بنائے۔ شاعری کی حدود کو وسیع کیا، اسے ایک نصب العین دیا اور سماجی و سیاسی قدروں کا احساس دلایا۔ حالی کے فکر و شعور اور ان کے لائے ہوئے خاموش انقلاب کو سمجھنے کے لیے انیسویں صدی کے آخری برسوں کی سماجی اور سیاسی تحریکوں پر نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔" [۱]

جبکہ شمس الرحمٰن فاروقی نے حالی کے ادبی نظریات سے بحث کرتے ہوئے حالی کو احساس کمتری کا شکار قرار دیا ہے۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے:

"آزاد، حالی اور امداد امام اثر اور ان کے متبعین کو مشرقی تصور الشاعر میں عیب ہی عیب نظر آتے تھے سچ ہے شکست خوردہ تہذیب سب سے پہلے فاتح تہذیب پر

---

[۱] ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری از گوپی چند نارنگ ص ۲۲۱

عاشق ہوتی ہے اس کو (HARRY LEVIN) نے
اقلیتی طبقے کی اپنے آپ سے نفرت SELF HATRED
سے تعبیر کیا ہے۔" ع[۱]

لیکن نارنگ صاحب نے مشرقی شعریات کے حوالے سے حالی کی ان صفات کا تجزیہ کیا ہے جس کی وجہ سے اردو میں شعر فہمی کی باضابطہ بنیاد قائم ہوئی۔ پروفیسر نارنگ کے مطابق حالی نے نظیریؔ، حافظ اور عرفی شیرازی وغیرہ کے شعری محاسن اور شاعری سے متعلق ابن رشیق کے افکار و خیالات سے مماثلت کی نشاندہی کرتے ہوئے حالی کے نظریۂ شعر کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :

"حالی نے اخذ و استفادہ کے ضمن میں ابن رشیق کے حوالے سے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ کلام اساتذہ کی مشق و مزاولت کا مقصد ان کو طبیعت کا حصہ بنانا ہے نہ کہ علم کو اوپر سے اوڑھ لینا۔" ع[۲]

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے حالی کے اس طرح کے

ع[۱] شعر شور انگیز از شمس الرحمان فاروقی جلد ۳ ص ۴۲
ع[۲] ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات از گوپی چند نارنگ ص ۴۷۹

تصورات اور خیالات کا سلسلہ جدید ترین لسانی اور ادبی نظریات سے جوڑ دیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے سوسیئر کے "نظریۂ لسان" میں استعمال ہونے والی دو اصطلاحوں لانگ اور پیرول (LANGUE PAROLE) کے معنی و مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے حالی کے نظریۂ شعر کا سلسلہ اس جدید نظریۂ لسان اور ادب سے قائم کیا ہے۔ نارنگ صاحب لکھتے ہیں۔

"حالی مشرقی ادبی لانگ میں اس قدر رچے بسے تھے اور ان کا ذوقِ شعر اس قدر مرتب اور بالیدہ تھا کہ ان کے اصلاحی پروجیکٹ کے نوآبادیاتی ہونے کے باوصف مقدمہ بجا طور پر اردو شعریات کی پہلی کتاب ہے۔ تاہم یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اصلاح کے جوش میں حالی کبھی کبھی اُن جڑوں پر بھی وار کر جاتے ہیں جن پر پیڑ قائم ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہوا کہ شعری فرسودگی اور میکانکیت کے خلاف آواز اٹھاتے وقت اسے وہ روایت سے الگ کوئی چیز تسلیم کر لیتے ہیں اور فرسودگی اور تازہ کاری میں جو جدلیاتی رشتہ روایت کے اندر اور روایت کی رد سے ہے

اس کو وہ نظر انداز کردیتے ہیں"۔[1]

دراصل گوپی چند نارنگ کے اندازِ نقد میں انانیت نہیں اور نہ وہ دوسروں کے لیے آمرانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں جیسا کہ ہم عام طور پر فاروقی کے یہاں دیکھتے ہیں چنانچہ سرسید تحریک کے ادبی پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے نارنگ نے وہ باتیں لکھی ہیں جن کا تعلق اردو زبان وادب اور اردو ادب کی نظریاتی اور فکری تبدیلی اور ترقی سے ہے۔

اسی طرح جدیدیت کے رجحان کے بارے میں بھی نارنگ کا نقطۂ نظر بہت واضح رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ۶۰ کی دہائی میں اردو میں جدیدیت کو قائم کرنے والوں میں فاروقی کے ساتھ ساتھ نارنگ کا بھی ایک اہم مقام رہا ہے لیکن ۸۰ کے آس پاس جب جدیدیت گمراہی اور فیشن پرستی کا شکار ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ عالمی ادب میں مابعد جدید صورت حال کے حوالے سے مابعد جدیدیت کے نام سے ادب کے نئے خدوخال نمایاں ہونے لگے تو نارنگ نے اس گمراہ کن اور فیشن زدہ جدیدیت کو ترک کیا اور مابعد جدیدیت کی حمایت کی۔ نارنگ نے اپنی مرتب کردہ کتاب "مابعد جدیدیت پر مکالمہ"

---

[1] ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات (از) گوپی چند نارنگ۔ ص: ۴۸۴

میں واضح طور پر لکھا ہے کہ انہوں نے جدیدیت کا ساتھ کیوں چھوڑا، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ جدیدیت اب ایک ناکام رجحان ثابت ہو چکی ہے جدیدیت، اپنے خول میں بند خوف و دہشت اور اجنبیت کے ایجنڈے کے بارے میں پروفیسر نارنگ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"اس سے شاید ہی انکار کیا جا سکے کہ ہم ایک نئی ثقافتی اور سماجی صورت حال کے روبرو ہیں۔ وہ لوگ جو معقولیت سے کام لیتے ہیں، دیکھ رہے ہیں کہ جدیدیت کے خوف دہشت اور اجنبیت والے ایجنڈے سے (جو مغربی وجودیت کی اترن تھا اور خالص ہیئت پسندی سے جس نے اردو کو بڑی حد تک سماجی ثقافتی ڈسکورس سے بے تعلق کر دیا تھا، نئی پیڑھی کے لکھنے والے علی الاعلان اس سے گریز کر کے نئے ڈسکورس سے جڑ چکے ہیں اور اردو میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔"[1]

---

[1] اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ مرتبہ گوپی چند نارنگ ص ۸۱-۸۰

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سابقہ اور حالیہ تخلیقی اور تنقیدی رجحانات اور رویّوں کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف تحریروں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے بارے میں نارنگ کا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں رجحانات یا تحریکات زوال کا شکار ہو چکی ہیں۔

گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں ساختیات اور مابعد ساختیات سے مربوط قرأتِ متن کے بارے میں جن ادبی نظریات اور تصورات کو متعارف کروانے کا عمل شروع ہوا ہے اس میں گوپی چند نارنگ ایک خاص کردار رہے ہیں چونکہ ترقی پسند تحریک اور اس کا ادب کافی زیرِ بحث رہا ہے اس لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ترقی پسند فکر کے بارے میں ادب کے حوالے سے لکھا ہے:

"آلتھوسے نے مارکس کو جس طرح بعض جگہ تحریر کیا ہے اور مارکسیت کے اندر رہ کر ادب اور آرٹ کی نسبتاً خود مختاری کی راہ نکالی اور کشادہ فکری کی گنجائش پیدا کی یا دوسروں نے مارکسیت کے امکانات پر جو کچھ لکھا ہے اس کے پیشِ نظر یہ توقع تھی کہ ترقی پسند تنقید اور ادب جیسے اردو

میں جدلیاتی اور متحرک روّیہ اپنانا چاہیئے تھا۔ نئی فکر سے
مکالمہ کرتی اور کھلے دماغ سے اپنا احتساب کرتی لیکن موجودہ
صورت حال میں ایسی توقع خوش خیالی سے زیادہ حیثیت
نہیں رکھتی"۔ ع[1]

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے صرف ترقی پسند ادب کی کمزوریوں کی ہی نشاندہی نہیں کی ہے بلکہ جدیدیت کے مجہول کردار کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے لکھتے ہیں :-

"جدیدیت نے ادب کی ادبیت اور ذہنی آزادی پر
زور دیا۔ اس دعوت میں بڑی کشش تھی لیکن افسوس کہ
جدیدیت نے تمام سیاسی معنی کو ادب سے خارج قرار
دے دیا۔ اس کی ایک بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے مصنف
کو تو رد کیا ہی تھا قاری کو بھی رد کر دیا اس لئے نئے شعور
کا نظریاتی موقف بے معنی ہو جاتا ہے۔" ع[2]

ع[1] پروفیسر گوپی چند نارنگ بحوالہ معاصر تنقید کی نارسائیاں از ابوالکلام قاسمی مطبوعہ استعارہ جلد ۲ ص ۵۰

ع[2] ایضاً

لیکن گوپی چند نارنگ نہ تو مارکسزم کو پورے طور پر رد کرتے ہیں اور نہ جدیدیت کے رجحانات کے تحت لکھے گئے سارے ادب کو معتوب قرار دیتے ہیں۔ دراصل نارنگ ادب کی صحت مند قدروں اور تعمیری رویوں کی حمایت کرتے ہیں خواہ وہ کسی بھی رجحان یا تحریک کے نام سے کیوں نہ سامنے آیا ہو۔

باب دوم

گوپی چند نارنگ کی تصنیفات

پروفیسر گوپی چند نارنگ بیک وقت ایک ناقد، مصنف، محقق، مقالہ نگار وغیرہ کے طور پر اقلیمِ ادب کے درخشاں ستارے کی حیثیت سے معروف ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نارنگ کی علمی وادبی سرگرمیوں کی نوعیت متعدد بھی ہے اور متنوع بھی مثلاً ادبیات، لسانیات، سماجیات، ساختیات، اسلوبیات، سمعیات، شعریات، تنقید وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ نارنگ اردو زبان وادب کا وہ درخشاں ستارہ ہے جو محتاجِ تعارف نہیں۔ نارنگ اردو زبان وادب کے وہ روشن چراغ ہیں جنہوں نے تاریک راہوں میں جوت جگا کر نئی پود کو روشن خیالی کی راہوں پر گامزن کیا۔ وہ کسی پڑاو کو منزل نہیں بناتے۔ وہ اردو کی فلاح وبہبود کے لئے

عملی وادبی طور پر کوشاں رہتے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اردو زبان وادب کے گیسو سنوارنے کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ نارنگ وہاں پہنچ کر اس زبان کے تئیں اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نارنگ اردو کے بے لوث سپاہی گردانے جاتے ہیں۔ اردو زبان وادب میں نارنگ کی خدمات کا اعتراف بین الاقوامی سطح پر کیا جاتا ہے۔ ہندوپاک کے علاوہ امریکہ میں بھی اردو زبان وادب پر جو تحقیقی کام آئے دن ہوتے رہتے ہیں ان میں بھی نارنگ کا ایک غیر معمولی کردار ہوتا ہے۔ ان کی اردو زبان وادب کی خدمت کو دیکھ کر حیرانی بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی۔ ناکامی و نامرادی اور تھکاوٹ و اکتاہٹ کا دخل ان کی فطرت میں کہیں نظر نہیں آتا جب دیکھو تازہ دم ہو کر نئی راہوں کے سفر کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ بقولِ ڈاکٹر سید منظور احمد

"پروفیسر نارنگ جتنا کام اردو زبان و ادب کا کرتے ہیں اس کو دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی، تھکن اور ہار، ناکامی اور نامرادی ان کی سرشت میں داخل نہیں جب دیکھو تازہ دم نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جیتا جاگتا کمپیوٹر ہے۔" [۱]

---

[۱] گوپی چند نارنگ۔ حیات و خدمات از ڈاکٹر محمد حامد علی خان ص ۲۷۵

گوپی چند نارنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص زاویہ تک محدود نظر نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک طرف جہاں کلاسیکی روایات کے حامی ہیں وہیں دوسری طرف جدیدیت کے مردِ میدان بھی جہاں انہوں نے روایتی ادب کے مسائل کا غائر مطالعہ کرکے اسے وسعت و کشادگی سے ہمکنار کیا وہیں وہ جدیدیت کے ایسے سرپرست ہیں کہ اگر وہ ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی کے دوش بدوش نہ ہوئے تو جدیدیت کی اصطلاح ادب سے کب کی خارج ہو چکی ہوتی ۔ غرض روایت اور جدیدیت کے خوبصورت سنگھم کو نارنگ کے یہاں جس انفرادیت کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے اسکی مثال ملنا ناممکن ہے ۔ نارنگ کی شخصیت میں جدیدیت اور روایت سے میلان کے ساتھ ساتھ ایک اور انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ گہرے اور وسیع تجربات کو بروئے کار لاکر اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کے علاوہ گھسی پٹی لکیروں سے ہٹ کر اپنے ہی دماغ سے سوچتے اپنے ہی طاقتِ ذہن کو استعمال کرتے اور اپنے ہی دل سے محسوس کرتے ہیں اور اپنی ذہانت و فراست سے پر اعتماد فیصلے صادر کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ نارنگ کی عملی و ادبی سرگرمیاں بے حد منفرد اور متنوع ہیں ۔ نارنگ کی شخصیت میں بیک وقت

ایک اعلیٰ درجہ ادیب، بلند پایہ محقق، کہن مشق نقاد، ایک ماہر لسانیات، ماہر سماجیات و ساختیات اور ماہر اسلوبیات و سمعیات وغیرہ کی بے شمار نہیں سٹی ہوئی ہیں جو ان کی حیات کو ادب کا ایک لافانی حصّہ قرار دیتی ہیں اس بات کی تصدیق احمد ندیم قاسمی کے اس خیال سے ہوتی ہے۔

"ڈاکٹر نارنگ کی علمی سرگرمیوں کی نوعیت بے حد متنوع ہے۔ بیک وقت ادبیات، لسانیات، سماجیات، اسلوبیات ساختیات وغیرہ پر پوری قدرت سے حاوی ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دورِ حاضر کی تخلیقی سرگرمیوں اور جدید حسیت کے زیرِ اثر لکھے جانے والے شعر و ادب کے بھی متوازن اور منصف مزاج تجزیہ نگار ہیں ..... بلاشبہ ڈاکٹر نارنگ کا شمار ان محققین و ناقدین میں ہوتا ہے جو عصر حاضر کے تخلیقی رویوں سے نہ صرف بیگانہ نہیں بلکہ ان کا گزیرپرحصہ ہیں۔" [۱]

---

[۱] کتاب نما کا خصوصی شمارہ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ: شخصیت اور ادبی حیات۔ ص ۲۸
مرتبین پروفیسر شہریار، پروفیسر ابوالکلام قاسمی

گوپی چند نارنگ کی صفات میں سے ایک خاص صفت انکی سلیقہ مندی ہے وہ ہر بات کو سلیقے کے ساتھ انجام دیتے ہیں دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تحریروں کو بھی نہایت سلیقے اور قرینے سے رقم کرتے ہیں یوں ان کی طرزِ تحریر میں عمیق نظر، باریک بینی، خوش مذاقی، تجزیاتی درک، جرأتِ فکر و اظہار ایک انفرادی قوت ودلیعت کر جاتی ہے جس کی شناخت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ یہ انفرادیت ہر قلمکار کو نصیب نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تحریروں میں حددرجہ جگر کاوی اور خونِ جگر کی آمیزش نہ ہو۔ نارنگ نے جس موضوع کو زیر بحث لایا، یا جس کسی بھی ادبی موضوع کو اختیار کیا اسکی تمام تہوں کو غائر مطالعے سے ذہن نشین کیا اور اس کی تمام تفصیلات و جزئیات کا عمیق نظروں سے بغورِ مشاہدہ کیا اور اپنے موضوع کے ساتھ مکمل انصاف کیا۔ اپنی بات کو ادا کرنے کا ہنر گوپی چند نارنگ کو خوب آتا ہے۔ جو موضوع زیر بحث لیتے ہیں قاری اسے مکمل طور پر ذہن نشین کرتا ہے۔ نارنگ کی اس خوبی کا اعتراف صفِ اول کے ناقد اور ان کے ہمعصر شمس الرحمان فاروقی بھی کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں نارنگ کی تحریر کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ ان کا مافی الضمیر

صاف وشستہ اور مکمل طور پر قاری کے سامنے آتا ہے شمس الرحمان فاروقی نارنگ کی تحریر کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں :

"آپ کی تحریر کو پڑھکر صاف صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ
آپ کیا کہہ رہے ہیں کس شاعر یا فن پارے کے بارے
میں آپکی کیا رائے ہے۔ کن باتوں کی بنا پر آپ اسے اچھا
یا خراب' کامیاب یا ناکامیاب قرار دیتے ہیں۔" [۱]

گوپی چند نارنگ ایک جدید ذہن رکھتے ہیں وہ ذکی بھی ہیں اور روشن دماغ بھی۔ جس کام پر بھی قلم اٹھاتے ہیں نہایت مشقت کے ساتھ اسے تکمیل کو پہنچاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کام متنوع ہوتے ہیں۔ وہ اردو زبان وادب سے بے لوث محبت کرتے ہیں اور اردو زبان وادب سے اپنے عطیات کے عوض معاوضے کے خواہاں نہیں رہتے۔ حالانکہ اردو نارنگ کی مادری زبان نہیں ان کی ابتدائی پرورش (دُکی) بلوچستان کے غیر اردو ماحول میں ہوئی ہے لیکن پھر بھی اسمیں نارنگ نے اپنی شخصیت کی عظمت کا لوہا منوایا۔

[۱] گوپی چند نارنگ حیات وخدمات (مصنفہ) ڈاکٹر محمد حامد علی خان
ص ۴۴۳۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی [۲]

ان کی شخصیت ایک ایسی ہی شخصیت جس نے گھر خاندان اور مذہب سے بالاتر ہوکر ایک ایسی زبان اختیار کی جس کے ساتھ ان کا تعلق صرف لگاؤ کی حد تک تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس زبان سے ان کا لگاو کا رشتہ اس قدر استوار اور ہمہ گیر ہوتا گیا کہ آخر میں یہ زبان نارنگ کا حصہ اور نارنگ اس زبان کا حصہ بن گئے۔ اردو زبان اور نارنگ کے درمیان اس قدر عشق کا معاملہ ہے جو عاشقانِ اردو کے لیے لائقِ صدر شک ہے چنانچہ نارنگ خود اردو کے تئین اپنی دلچسپی اور رغبت اِن خوبصورت الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ :

> "..... میری مادری زبان سرائیکی ہے اردو سے میرا معاملہ عشق کا ہے اور عشق میں وجہیں نہیں ہوتی بس دل کھینچتا ہے....." ؎۱

ہر چند کہ گوپی چند نارنگ کا ادبی سفر ۱۹۵۲ء سے ۲۰۰۴ء تک نصف صدی سے زائد مدت پر محیط ہونے جا رہا ہے اور یہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ ان کے کام میں خواہ وہ لسانیات یا اسلوبیات سے تعلق رکھتا ہو یا اساطیری و دیومالا، کتھا کہانی فکشن، یا فن شناسی، فنکار شناسی سے

؎۱ کتاب نما۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ (شخصیت اور ادبی خدمات) ص۔۹۸

یا ادبی تھیوریز سے لیکن جڑوں کی کھوج یا تہذیبی رشتوں کی بازیافت کہیں نمایاں تو کہیں پوشیدہ ہمیشہ ان کے ہمرکاب رہی ہے اور ان کی ذہنی ترتیب کے لئے راہ نما کا کام انجام دیتی رہی ہے اور اس میں پروفیسر نارنگ حد درجہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور ساتھ ہی تقویت انہیں اس امر سے بھی حاصل ہوئی کہ نئی تھیوریز اور مابعد جدیدیت کی پیش قدمی کے بعد تہذیبی جڑوں کے تفاعل اور مقام اور تمدّنی و تہذیبی مطالعہ کو ادب شناسی میں مکمل طور پر مرکزیت حاصل ہوگئی اور جس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے نارنگ نے نصف صدی پہلے شروع کیا تھا اسکی اہمیت اور معنویت میں اضافہ ہوگیا۔

اب جہاں تک نارنگ کے ادبی سفر کا تعلق ہے اس کی ابتدا اولاً افسانہ نگاری سے ہوئی۔ اسکولی طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر نارنگ کی افسانوی تحریریں کوئٹہ کے ہفتہ وار "بلوچستان سماچار" میں شائع ہونا شروع ہوئیں۔ آگے چل کر کالج کا زمانہ آیا تو نارنگ کی طبیعت تنقید نگاری کی طرف مائل ہوئی جس کا ثبوت ان کا وہ پہلا تنقیدی مضمون ہے جس کا عنوان "اکبرالہ آبادی ہندوستان اور پاکستان کی نظر میں" تھا یہ مضمون

۱۹۵۴ء میں "نگار" لکھنؤ میں چھپا۔ اس کے بعد پروفیسر نارنگ تنقید کے ہی ہو کر رہ گئے۔ رفتہ رفتہ گوپی چند نارنگ کا ذہن لسانیات، اسلوبیات، سمعیات نحویات، معنیات وغیرہ وغیرہ شعبہ ہائے زبان و ادب میں ارتقائی منزلوں کی طرف گامزن ہوا جس کے نتیجے میں انکی تحقیقی و تنقیدی تصانیف و تالیفات اردو و ادب کا ایک عظیم سرمایہ بنتی چلی گئیں اور ان کا نام اردو تحقیق و تنقید میں اعتبار اور معیار کی علامت بن گیا۔ گوپی چند نارنگ نے نہ صرف اردو میں اردو زبان و ادب کے قدیم و جدید مسائل پر قلم اٹھایا ہے بلکہ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی زبانوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ان زبانوں میں بھی عموماً اردو ادب کے مسائل سے ہی بحث کی ہے۔ اردو میں نارنگ کے بیش بہا خطبات بھی منظر عام پر آچکے ہیں یہ خطبات انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً دوسو سے زائد مضامین مختلف رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ اب جہاں تک نارنگ کی تصنیفات و تالیفات کا تعلق ہے یہ اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اپنی زندگی کے نصف صدی سے زائد کے ادبی سفر میں انہوں نے جو تصنیفات و تالیفات اردو ادب کو ودیعت کی ہیں ان کی تعداد چالیس

سے زیادہ ہے۔ یہ سفر ۵۳-۱۹۵۲ء میں "ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" سے شروع ہوتا ہے اور اس بیان کی تصحیح نارنگ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

IT IS ABOUT HALF A CENTURY AGO THAT I BEGAN MY SCHOLASTIC JOURNEY I HAD BEGAN TO WORK IN 1952-53, AND MY FIRST PUBLISHED BOOK WAS — "HINDUSTANI QISSON SE MAKHOOZ URDU MASNAWIAN" (URDU MASNAWIS BASED ON INDIAN FOLK TALES) [1]

پروفیسر نارنگ کسی مخصوص پڑاو کو منزل نہ سمجھ کر آئے دن اپنی فنی اور ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ نت نئے عنوانات سے کرتے رہتے ہیں ۔

---

1. URDU ALIVE — SUMMER 2002 NO ASHA PURI LUDHIANA PUNJAB — P. NO. 02,

پروفیسر نارنگ کی ادبی خدمات کا اندازہ ان کی تحریروں کی درج ذیل فہرست سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔

سن اشاعت		موضوع
		۱۔ اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر (غیر مطبوعہ)
۱۹۵۷ء		مقالہ برائے پی ایچ ڈی
۱۹۵۷ء		۲۔ معراج العاشقین (مقدمہ و تحشیہ)
		آزاد کتاب گھر (دہلی)
		۳۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں
۱۹۶۰ء	(طبع اول)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی)
		۴۔ KARKHANDARI DIALECT OF DELHI URDU –
۱۹۶۱ء		MUNSHI RAM MANOHARLAL (DELHI)
۱۹۶۱ء	(طبع اول)	۵۔ اردو کی تعلیم کے لسانی پہلو
۱۹۶۲ء	(طبع دوم)	آزاد کتاب گھر (دہلی)
		۶۔ ادبی تحریریں (ڈاکٹر زور) مرتبہ
۱۹۶۳ء		ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد)

۷۔ URDU : READINGS IN LITERARY

URDU PROSE. طبع اول ۱۹۶۸ء

WISCONSIN UNIVERSITY PRESS (AMERICA)

NATIONAL COUNCIL FOR

PROMOTION OF URDU LANGUAGE

(NEW DELHI) طبع دوم انڈین ایڈیشن ۲۰۰۱ء

۸۔ منشوراتِ کیفی (ترتیب و مقدمہ) ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو ہند (دہلی)

۹۔ آثارِ محروم (مرتبہ)

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) ۱۹۶۹ء

۱۰۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (باشتراک) ۱۹۷۰ء

مکتبۂ شاہراہ (دہلی)

۱۱۔ ارمغانِ مالک (مرتبہ) ۱۹۷۱ء

مجلس ارمغانِ مالک (دہلی)

۱۲۔ املانامہ (مرتبہ) ۱۹۷۴ء

ترقی اردو بیورو (دہلی)

۱۳۔ پرانوں کی کہانیاں
نیشنل بک ٹرسٹ (دہلی) ۱۹۷۶ء

۱۴۔ اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں (مرتبہ)
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) ۱۹۷۹ء

۱۵۔ وضاحتی کتابیات، جلد اول بابت ۱۹۷۶ء (باشتراک) ۱۹۸۰ء
ترقی اردو بیورو (دہلی)

۱۶۔ اردو افسانہ: روایت اور مسائل (مرتبہ)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس (دہلی) ۱۹۸۱ء

۱۷۔ انیس شناسی (مرتبہ)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس (دہلی) ۱۹۸۱ء

۱۸۔ انڈین پوئٹری ٹوڈے (انگریزی) (جلد چہارم؛ حصہ اردو)
انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (دہلی) ۱۹۸۱ء

۱۹۔ سفر آشنا
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس (دہلی) ۱۹۸۲ء

۲۰۔ اقبال کا فن (مرتبہ)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس (دہلی) ۱۹۸۳ء

۲۱- نئی کرن
این سی ای آر ٹی (دہلی) ۱۹۸۳ء

۲۲- نئی روشنی
این، سی، ای، آر، ٹی (دہلی) ۱۹۸۳ء

۲۳- بڑھوا اور بڑھو
ایضاً (دہلی) ۱۹۸۳ء

۲۴- اضافی کتابیات' بابت جلد دوم ۷۸-۱۹۷۷ء (باشتراک)
ترقی بیورو (دہلی) ۱۹۸۴ء

۲۵- لغت نویسی کے مسائل (مرتبہ)
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) ۱۹۸۴ء

۲۶- اسلوبیاتِ میر
(۱) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۸۴ء
(۲) انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) ۱۹۸۵ء

۲۷- CONTRIBUTION OF URDU WRITERS TO INDIAN FREEDOM MOVEMENT (P. 527 – 570) (مرتبہ) ۱۹۸۵ء
INDIAN WRITERS UNION (KERALA)

۲۸۔ سانحۂ کربلا بطور ایک شعری استعارہ (طبع اول: دہلی) ۱۹۸۶ء
سنگ میل پبلی کیشنز (دہلی) (طبع دوم: لاہور) ۱۹۹۱ء

۲۹۔ انتظار حسین اور ان کے افسانے (مرتبہ)
ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ) ۱۹۸۶ء

۳۰۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ گیارہ — باشتراک)
این سی ای آر ٹی (دہلی) ۱۹۸۶ء

۳۱۔ امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر
(۱) امیر خسرو سوسائٹی امریکہ شکاگو (طبع اول) ۱۹۸۷ء
(۲) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور (طبع دوم) ۱۹۹۱ء
(۳) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (طبع سوم) ۱۹۹۱ء

۳۲۔ نیا اردو افسانہ: انتخاب، تجزیے اور مباحث (مرتبہ) ۱۹۸۸ء
دہلی اردو اکادمی (دہلی)

۳۳۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ بارہ — باشتراک) ۱۹۸۹ء
این سی ای آر ٹی (دہلی)

۳۴۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۸۹ء

۳۵۔ راجندر سنگھ بیدی (انگریزی تھالوجی) ۱۹۸۹ء
ساہتیہ اکادمی (دہلی)

۳۶۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ اول) ۱۹۸۹ء
این' سی' ای' آر' ٹی (دہلی)

۳۷۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ دہم) ۱۹۸۹ء
ایضاً

۳۸۔ کرشن چندر (انگریزی ہیتھالوجی) ۱۹۹۰ء
ساہتیہ اکادمی (دہلی)

۳۹۔ املانامہ (نظر ثانی واضافہ) ۱۹۹۰ء
ترقی بیورو (نئی دہلی)

۴۰۔ अमीर ख़ुसरो का हिन्दवी काव्य (امیر خسرو کا ہندوی کلام) ۱۹۹۱ء
सीमान्त प्रकाश (दिल्ली) (سیمانت پرکاش دہلی)

۴۱۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ پنجم ۔ بااشتراک) ۱۹۹۱ء
این سی ای آر ٹی (دہلی)

۴۲۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ دوم) ۱۹۹۱ء
ایضاً

۴۳- URDU LANGUAGE & LITERATURE
CRITICAL PERSPECTIVES/ STERLING PUBLISHERS (NEW DELHI) ۱۹۹۱ء

۴۴- قاری اساس تنقید
ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ) ۱۹۹۲ء

۴۵- ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۹۳ء

۴۶- اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) جولائی ۲۰۰۲ء

۴۷- ترقی پسندی جدیدیت اور مابعد جدیدیت
ایڈشاٹ پبلی کیشنز ممبئی۔ ۲۰۰۴ء

گوپی چند نارنگ نے اردو انگریزی اور ہندی زبانوں کو جو عطیات دیئے ہیں انکی تفصیل مندرجہ بالا تصنیفات و تالیفات پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے علاوہ بھی اردو ادب کو انگریزی اور ہندی زبانوں کے حوالے سے گرانقدر عطیات عنایت کئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مثلاً ان کی چند ہندی اور انگریزی کتابوں کی تفصیل یوں ہے:

۴۸- اردو کی نئی بستیاں
ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۲۰۰۶ء

۴۹- اردو زبان اور لسانیات - رام پور رضا لائبریری ۲۰۰۶ء

1. LET US LEARN URDU: BIGGINERS MANUAL FOR URDU SCRIPT.
2. BALWANT SINGH: SLECTED SHORT STORIES.
3. ANTHOLOGY OF MODERN POETRY FOR INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS.

وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہندی میں بھی کتابوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہونے لگی ہے جن میں نمونتاً چند ایک اسطرح ہیں :

1. पाठक आधार आलोचना (پاٹھک آدھار آلوچنا)
2. संरचनावाद, उत्तर संरचनावाद एवं प्राच्य काव्यशास्त्र — سانرچناواد اترسانرچناواد ایک پراچیہ کاوی شاستر
3. बलवन्त सिंह की श्रेष्ठ कहानियाँ — بلونت سنگھ کی شریشٹھ کہانیاں
4. उर्दू कैसे लिखें! (اردو کیسے لکھیں)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی علمی وادبی شخصیت کے ابتدائی وارتقائی مرحلوں کا غائر جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے زبانِ اردو اور ادب اردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی اہمیت وافادیت کو اردو زبان وادب کی ترقی و ترویج کے ہر دور میں محسوس کیا جائے گا۔ اردو ادب اور لسانیات کا جہاں تک تعلق ہے نارنگ کی تحریریں نہ صرف اس سلسلے میں نہایت اہم اور رفیع ثابت ہوئی ہیں بلکہ اردو زبان وادب کے فلاح و بہبود اور ترقی و تنزّلی کے معاملے میں نارنگ نہایت صحت منداور مثبت زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں وہ اردو کے سیکولر کردار، کشش اور قوت کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لانے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ نارنگ نے اس ضمن میں کافی تجسس سے کام لیکر زبانِ اردو کو برصغیر کی جمہوری زبان قرار دیتے ہوئے اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ اردو زبان نے ابتدا سے ہی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کی ہے نیز اس نے تاریخ اقوام کے تمام ادوار اور تمام تر خطوں میں اپنے منفرد وسیع المشرب لسانیاتی کردار نبھانے کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ کا کارنامہ "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں"

ہے جو پہلی بار ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آیا۔ نارنگ کے اس عظیم کارنامے کی داد تمام معاصرین نے دل کھول کر دی اور اس پر اتر پردیش سرکار نے گوپی چند نارنگ کو "غالب پرائز" سے بھی نوازا۔ نارنگ کے اس تحقیقی کارنامے کی اہمیت و عظمت کی دلیل اس بات سے بھی فراہم ہوتی ہے۔ کہ ڈاکٹر گیان چند جین اس زمانے میں اپنی تصنیف "شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقاء" پر تحقیق کر رہے تھے وہ اس بات کے معترف ہیں کہ اپنے تحقیقی کام میں انہوں نے نارنگ کی مذکورہ کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

اب جہاں تک اردو میں صنفِ مثنوی کا تعلق ہے۔ اردو میں مثنوی کی ابتداء نویں صدی ہجری سے ہوتی ہے ابتدا میں مثنوی کے موضوعات اکثر متصوفانہ ہوتے تھے تاہم اس ابتدائی دور کی ہی پیداوار "کدم راو پدم راو" بھی ہے۔ بہمنی دور کے بعد گولکنڈہ اور بیجا پور وغیرہ جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مثنوی نگاری مسلسل جاری رہی۔ شمالی ہندوستان میں افضل کے "بارہ ماسہ" اور "عاشورہ نامہ" کے بعد مثنوی نگاری کا سلسلہ قائم ہوتا ہے علاوہ ازیں مشرقی اور مغربی ہند کے علاقوں میں بھی مثنویاں تحریر کی گئیں جو یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئیں۔ اردو مثنوی کا سرمایہ

نویں صدی ہجری سے لیکر بیسویں صدی عیسوی تک کی مدت پر محیط ہے اور اس میں لاتعداد چھوٹی بڑی مثنویاں رقم کی جاچکی ہیں۔ مثنوی اردو ادب کی وہ صنف ہے جو اپنی نشوونما کے لیے کئی ذرائع سے مستفید ہوئی اور مواد کی فراہمی کے غرض سے دیسی بدیسی موضوعات اور عنوانات کا انتخاب کیا۔ اس سلسلے میں ماخذات کے اعتبار سے مثنوی کے سرمائے کو یوں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ خالص ہندوستانی قصے اور دوسرے موضوعات پر مشتمل تخلیقی مثنویاں۔

۲۔ غیر ہندوستانی ماخذات اور موضوعات پر مشتمل تخلیقی مثنویاں اور عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ سے ترجمہ کی ہوئی مثنویاں۔

ہندوستان کے شعراء خواہ وہ جنوبی ہند سے تعلق رکھتے ہوں یا شمالی ہند سے مثنوی ان کی طبع آزمائی کا محبوب ترین ذریعہ رہا ہے اگرچہ ابتدائی دور میں شمالی ہند میں مقابلتاً غزل کی صنف زیادہ مروج رہی لیکن مثنویاں بھی لکھی جاتی رہیں۔ آبرو، ناجی، یکرنگ وغیرہ کی محبوب صنف غزل تھی لیکن انہوں نے مثنویاں بھی تحریر کیں۔ بعض شعراء مثلاً روشن علی اسمٰعیل وغیرہ کی صرف مثنویاں ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ مثنوی کی فراخ دامانی

کسی قید کی محتاج نہیں اسکا ظرف اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ فکرِ انسان لہذا ہندوستانی تمدن کی وسعت مثنوی میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مثنویوں میں ہندوستانی میلوں، تقریبوں، تہواروں اور رسوم و رواج کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہولی اور عید جیسے تہواروں کو اگر دیکھا جائے تو ان خوشی کے تہواروں کے نشاط آمیز بیانات کم از کم ذیل کے ان مثنوی نگاروں کے یہاں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً شاہ حاتمؔ، میرؔ، افسوسؔ، قائمؔ، رنگینؔ، خواجہ وزیر کے فرزند خواجہ سفیر وغیرہ کے یہاں ان کی تفصیلات خاصے پُرجوش ہیں داستانی مثنویوں کی روح بھی ہے۔ بعد کی مثنویاں ہندوستان کے جدید تہذیب کے لوازمات کی عکاسی کرتی ہیں ان میں مثال کے طور پر نظیر کی مثنوی "ریاض عشق" کو نمونتاً پیش کیا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں خاندانی رشتوں، منظر نگاری اور ادبی معلومات میں بھی مثنویوں کا ایک اچھا خاصا عمل دخل رہا ہے۔ اردو شاعری پر اگر نظر ڈالی جائے تو غزلیات کے بعد ایک گراں قدر ذخیرہ مثنویات کا ہے مثنوی نگاری میں کسی خاص موضوع یا بحر کی قید نہیں۔ مثنوی کسی بھی بحر میں اور کسی بھی موضوع پر کہی جا سکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک مثنوی کے

قافیاتی نظام کا تعلق ہے یہ بھی تمام اصناف شاعری سے آسان ہے یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا سے ہی مثنوی نگاری کا رواج دیکھنے کو ملتا ہے چنانچہ اردو شاعری کی تاریخ میں جتنے بھی شعراء گزرے ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے مثنوی نہ کہی ہو۔ اسی لیے اردو میں مثنویات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ جس کی چھان بین کا ذمہ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے سر لیا۔ پروفیسر نارنگ نے اردو مثنویوں کے اس انبارِ بے پایاں کو دو بڑے حصوں، مقامی اور بیرونی میں منقسم کیا پھر پہلی یعنی مقامی مثنویوں کی، موضوع کے اعتبار سے چھ [6] قسمیں وضع کیں جن کی تفصیل کچھ اسطرح سے ہے۔

۱۔ مذہبی مثنویاں: یعنی مذہبی عقائد کی ترجمان مثنویاں۔

۲۔ تاریخی واقعات سے منسلک مثنویاں۔

۳۔ معاشرتی کوائف و آثار کی حامل مثنویاں یعنی وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کے معاشرتی کوائف و آثار کی تفصیل ملتی ہے۔

۴۔ ہندوستان کے فطری مناظر کی ترجمان مثنویاں یعنی وہ مثنویاں جو ہندوستان کے فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں ہیں۔

۵۔ حبُ الوطنی کے جذبات سے وابستہ مثنویاں یعنی وہ مثنویاں جن میں حبُ الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

۶۔ ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں :

آخری قسم یعنی ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویوں پر ڈاکٹر نارنگ نے زیرِ نظر کتاب میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے یعنی یہاں صرف ان مثنویوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویوں سے ہے۔ پھر انہیں زمان و مکان کے لحاظ سے چار شعبوں یعنی (۱) پورانک قصے (۲) لوک کہانیاں (۳) تاریخی قصے اور (۴) ہند ایرانی قصے' میں منقسم کرکے ہر شعبے کی مثنویوں کا فنی و تاریخی، تحقیقی و تحلیلی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں ابواب کی تقسیم کو بھی اسی انداز میں عمل میں لایا گیا ہے اور اس اعتبار سے مقامی کہانیوں پر مبنی اردو مثنویوں کی روشنی میں ہندو مسلم تہذیب کی ایسی عکاسی کی ہے جو اپنے موضوع کی خوبصورتی اور فکر و نظر کی تازگی کی بدولت اردو کے تحقیقی و تنقیدی سرمائے میں ایک بیش قیمت اور بے مثال اضافہ ہے۔ یہ تصنیف پروفیسر نارنگ کے سیکولر ذہن اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب

کے دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ نامور ادیب سید مسعود حسن رضوی ڈاکٹر نارنگ کے اس گراں قدر عالمانہ تحقیقی کام اور موضوع کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں :-

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردو شاعری کے دیسی عناصر پر اتنی تحقیق کی ہے اور اس مضمون کے ہر پہلو کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ ان کو اس مضمون کا ماہر خصوصی سمجھنا چاہیے۔ انہوں نے کثیر التعداد مثنویوں کی مزوری اور مناسب ترتیب کے ساتھ نشاندہی کی ہے جو ہندوستانی قصوں پر مبنی ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے ان مثنویوں کو اپنی عالمانہ تحقیقی کتاب کا موضوع قرار دے کر صرف اردو ادب کی نہیں بلکہ ہندوستانی کلچر کی بھی قابل قدر خدمت کی ہے"۔ ؎۱

گوپی چند نارنگ کی تصنیف "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسکی داغ بیل ان کے ڈاکٹریٹ کے زمانے میں ہی ڈال دی

؎۱ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں (از) گوپی چند نارنگ ص ۳۶۱

گئی تھی اور یہ انکشاف بجا طور پر صحیح تسلیم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نارنگ کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ دیکھنے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کی داغ بیل زمانۂ ڈاکٹریٹ میں ہی لازمی طور پر پڑ گئی ہوگی، چنانچہ اس مقالے میں تقریباً ۶۰ صفحات پر مشتمل باب "ہندوستانی قصے کہانیاں" ہندوستانی قصوں پر ہیں غالباً یہی باب بعد میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ اردو مثنویوں والی کتاب کی شکل میں سامنے آئی۔ نارنگ نے اپنے اس تحقیقی کارنامے کو اپنی محنت سے وسعت و کشادگی دے کر اردو مثنویوں پر ایسا مبسوط و منفرد کام پیش کیا ہے جس کی مثال ان سے پہلے یا ان کے بعد اب تک اردو تحقیق و تنقید فراہم نہیں کر سکی ہے۔ اگست ۱۹۵۹ء میں اس کتاب کا نقش اول گوپی چند نارنگ تیار کر چکے تھے اس وقت نہ گیان چند جین کی کتاب منظر عام پر آئی تھی نہ ہی سید عقیل رضوی کی بلکہ اس موضوع پر کام کرنے والوں نے پروفیسر نارنگ کی اس کتاب سے ہی استفادہ کیا ہے اور آیندہ بھی اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیئے نارنگ کی یہ کتاب بے حد کارآمد ثابت ہوگی اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نارنگ نے اس تحقیق میں کافی جگر کاوی سے مواد فراہم کیا ہے اور اسکی باضابطہ ترتیب سے اس صحرا میں وارد ہونے والوں کے لئے اپنے نقش پا

رکھ چھوڑے ہیں تاکہ انکی منزل کی سمت آسانی سے متعین ہو۔ جناب امتیاز علی عرشی، پروفیسر نارنگ کے اس کارنامے کے تئیں اپنی دادِ تحسین ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

"آپ نے مواد فراہم کرنے اور پھر اسے باضابطہ مرتب کرنے میں جو کاوش کی ہے، وہ ستائش و آفرین کی مستحق ہے۔ اس راہ پر پہل کرنے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے اور آئندہ جو کوئی بھی مثنویوں کے اس پہلو سے بحث کرے گا، وہ آپ کی راہبری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا۔" ؎[۱]

نارنگ کی تحقیقی کاوشوں میں "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" سب سے زیادہ متاثر کن کوشش ہے۔ یہ کتاب نارنگ نے پی ایچ ڈی کے مقالے کے بعد تصنیف کی تھی جو اضافوں کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی اور دوبارہ مکمل نظرِ ثانی کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ تحقیق کا اولین اصول نئی سمتوں کی دریافت

؎۱ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں از گوپی چند نارنگ ص ۳۶۱

ہے اور نارنگ کی یہ تحقیق اس اصول کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے کیونکہ "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" ایک نئی سمت میں انجام دیا گیا کارنامہ ہے۔ اب جہاں تک نارنگ کی اس نادر تحقیقی کتاب کا تعلق ہے۔ اردو کے وجود کو دیکھے اور اس کے شواہد کو پہچانے بغیر اردو پر طنز کے نشتر کچھ اس طرح چبھو دیئے جاتے ہیں کہ اس زبان میں الفاظ کا جو وسیع و قیع سرمایہ ہے وہ غیر ملکی ہے اور ایسے بیانات کی بعض ذمہ دار اشخاص بھی تصدیق کرتے ہیں۔ اردو ادب کا غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو میں افسانوی ادب شعری ادب اور تحقیقی و تنقیدی ادب تک ہر میدان میں ہندوستانی سماجی اور ثقافتی عناصر بکھرے پڑے ہیں۔ اردو نظم و نثر میں ہندوستانی قصوں کی ایک گرانقدر و تعداد دیکھنے کو ملتی ہے۔ کہیں ترجمے تو کہیں تصانیف، کہیں ماخوذ تو کہیں کچھ معاملات ان کے بارے میں گوپی چند نارنگ نے ضروری معلومات کو اکٹھا کر کے ایک ادبی، تاریخی اور تحقیقی ہر لحاظ سے ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی۔ جناب گلزار جاوید مدیر "چہارسو" پاکستان نے گوپی چند نارنگ سے "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" کے ضمن میں ایک انٹرویو میں ایک سوال پوچھا

کہ مذکورہ تصنیف کا خیال ان کے ذہن میں کیونکر آیا اور اس سے اردو ادب کے قارئین کو کیا فوائد حاصل ہونگے؟ نارنگ جواباً یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" میرے اس بڑے کام کا حصہ ہے جس کا ڈول میں نے ۱۹۵۴ء میں دہلی یونیورسٹی کے ایم، اے (اردو) کرنے کے بعد ڈالا تھا۔ میری ڈاکٹریٹ کا موضوع اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ تھا۔ مثنوی والا کام میرے پی ایچ ڈی کے تھیسز کا فقط ایک چیپٹر تھا۔ ۵۵۔۵۰ صفحے کا۔ اس سے بہت دلچسپ نتائج سامنے آئے اور میں دو تین سال مزید اس پر کام کرتا رہا۔ یوں وہ کتاب ۱۹۶۱ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی جس سے ثابت ہوا کہ اردو کی جڑیں ہماری ملی جلی تہذیب میں دور دور تک پیوست ہیں مثلاً اردو میں فقط یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد ہی نہیں، ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہیوال مرزا صاحباں بھی ہیں۔ اسی طرح شکنتلا اور کامروپ و کلا

کام بھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہماری شاہکار مثنویاں
سحر البیان اور گلزار نسیم، ہندو مسلم ربط وارتباط کا لاجواب
مرقع ہیں میں نے دنیا بھر کے کتب خانوں اور عجائب گھروں
میں ان قصے کہانیوں کی جڑوں کو تلاش کیا سنسکرت و
فارسی کے نسخوں کا پتہ بھی چلایا اور اردو کے منظوم و نثری
نسخوں کی بھی نشاندہی کی اور قلمی نسخوں کی بھی جو ہنوز
غیر مطبوعہ ہیں۔ ادھر یہ کتاب بعد از نظر ثانی (نظر ثانی)
۲۰۰۱ میں قومی اردو کونسل سے مزید اضافوں کے ساتھ
تقریباً چار سو صفحوں پر مشتمل شائع ہو گئی ہے۔" [۱]

نارنگ کی کتاب "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں" کے مطالعے سے نارنگ کے سیکولر مزاج کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے میں بکھری ہوئی داستانیں اور قصے میں انہوں نے نسل، مذہب ملک کی کوئی قید تسلیم نہیں کی ہے۔ یہ خوبی نارنگ کی اکثر تحریروں میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس تحقیقی تصنیف کی محرک بھی نارنگ کے ادبی سیکولرازم

---

[۱] "انشاء" کا گوپی چند نارنگ نمبر (مرتبہ) ف س اعجاز ص ۶۲

کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اردو زبان و ادب کے فروغ و ترقی کے سلسلے میں بھی نارنگ نے نہایت صحت مند اور متوازن نقطۂ اختیار کیا ہے اور اردو کی جمہوری کشش اور قوت کو نمایاں کرنے کی کاوشیں کی ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے لسانیاتی صداقتوں اور تحقیق کی بنیاد پر اردو زبان کو برصغیر کی سب سے زیادہ سیکولر زبان قرار دیتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار بھی رہی ہے اور اس نے ماضی کے ہر دور میں اور ہر خطے میں اپنے وسیع المشرب اور لاثانی ولافانی کردار کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ کی تحریروں کی ایک اور خوبی زبان کی پختگی اور شائستگی ہے۔ دور جدید میں خاص طور پر تحقیق و تنقید میں پروفیسر نارنگ سے زیادہ معیاری شستہ اور شگفتہ نثر کوئی دوسرا شخص نہیں لکھتا۔ اس کے علاوہ پروفیسر نارنگ کی نثر میں جو روانی اور کشش ہے وہ قارئین کو مائل کرنے کی بھی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" نارنگ کا صنف مثنوی پر وہ کارنامہ ہے جو اپنی نوعیت کا غیر معمولی تحقیقی کام ہے چنانچہ نارنگ کے اس کارنامے کے بعد صنف مثنوی پر جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں موضوع کی مناسبت کے اعتبار سے

زبان و بیان کے لحاظ سے اور تحقیق اور اندازِ بیان کے حوالے سے ڈاکٹر نارنگ کا لاثانی و لافانی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور جیسے صف اول کے محقق نے بھی اعتراف کیا ہے کہ

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو کے ان ادیبوں میں سے ہیں جن کی تحریر میں پختگی اور شائستگی جھلکتی ہے وہ اردو کے مزاج داں ہیں اور کلاسیکی ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔ ان کی تحقیق سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ اردو مثنویاں گل و بلبل کی داستاں ہیں اور ملکی و عوامی روایات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی ذات سے اردو کی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ تیج بہادر سپرو اور برج موہن دتا تریہ کیفی کے بعد اردو دنیا کے ایسے دیدہ ور کی منتظر تھی جو اپنے ادبی و علمی کاموں سے اردو کے تہذیبی کردار کو زیادہ سے زیادہ واضح کر سکے۔" [۱]

۱؎ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ از۔ گوپی چند نارنگ ص ۲۶۳

گوپی چند نارنگ کا یہ تحقیقی کارنامہ اس اعتبار سے بھی انفرادیت کا حامل ہے کہ اگرچہ اردو مثنویوں کے ادبی اور تاریخی ارتقاء پر عبدالقادر سروری اور امیر احمد علوی وغیرہ جیسے قلمکاروں نے توجہ صرف کی تھی تاہم اردو مثنویوں ہندوستانی قصوں اور ہندوستانی بنیادوں یعنی ہندوستان کی صدیوں سے چلی آرہی معاشرت اور ثقافت اور اردو مثنویوں کے مابین جو رشتہ ہے اسکی طرف کسی نے اپنی توجہ مرکوز نہیں کی تھی اور اس اہم نقطہ پر اولاً قلم اٹھانے کا سہرا سب سے پہلے گوپی چند نارنگ کے سر ہی ہے کہ انہوں نے اس اہم مسئلے یعنی اردو مثنویوں کی ہندوستانیت کا نہ صرف مقدمہ پیش کیا بلکہ اس موضوع کو تحقیق و تجسس اور جملہ اثبات کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا۔ چنانچہ جہاں تک نارنگ صاحب کی فطرت کا تعلق ہے وہ جس کسی موضوع پر لکھنے بیٹھتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں کا غائر جائزہ لیتے ہیں اور یہی صفت زیر نظر کتاب میں بھی نظر آتی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر گیان چند جین کی اردو مثنویوں کے حوالے سے جو ضخیم تحقیقی کتاب ہے اسکی جامعیت بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن نارنگ صاحب کی کتاب کا موضوع مختلف اور متنوع ہے اور بلاشبہ اردو مثنویوں کی قصص بنیادوں پر سلیقہ مندی، جامعیت اور دلکشی

کے ساتھ کیا گیا کام ہے۔ پروفیسر نارنگ کو اس بات کا قوی احساس تھا کہ غزل کے بعد اردو شعرا نے جس صنف سخن پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ وہ مثنوی ہی ہے لیکن موجودہ دور کی تیز رفتار اردو تحقیق میں اردو مثنوی کی اہمیت پر کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی جو نہایت افسوسناک بات ہے اس کا ذکر کتاب کے مقدمہ میں ہی پروفیسر نارنگ مفصل کر چکے ہیں اور جب کہ پروفیسر نارنگ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو اس موضوع کے حوالے سے تمام گتھیاں سلجھا کر رکھ دیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے ادب اردو میں اس خلا کو پُر کیا اور اس کمی کو دور کیا۔ پروفیسر نارنگ کے اس کارنامے کی اہمیت کے بارے میں پروفیسر آلِ احمد سرورؔ نے لکھا ہے:-

"ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کارنامہ ہے۔ اردو مثنویوں میں جو فضا اور ماحول ہے اس کی طرف ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس کمی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور نہایت تلاش اور تحقیق سے اردو مثنویوں

کی ہندوستانی بنیاد کا جائزہ لیا ہے۔ نارنگ جس موضوع
پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سارے گوشوں پر نظر رکھتے
ہیں۔ انہوں نے تحقیق کے ان نوادر کو جو نظروں سے
اوجھل تھے، یکجا کرکے ایک داستان مرتب کی ہے
جس میں معلومات کے ساتھ دلکشی بھی ہے۔ مجھے یقین ہے
کہ اردو کی ہندوستانی بنیاد کو واضح کرنے میں یہ کتاب
نہایت مفید ہوگی اور اس کے اثر سے اردو مثنوی کے
سرمائے کو ہمارے ادب کی عظمت متعین کرنے
کے سلسلے میں مناسب اہمیت دی جائے گی۔" [۱]

غرض یہ کہ "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" پروفیسر نارنگ کی پہچان کا ایک غیر معمولی حصہ ہے اور اردو ادب میں نارنگ کی شہرت و عظمت کا قابلِ قدر سبب بھی۔ پروفیسر نارنگ کی یہ کتاب اپنے موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اب تک حرفِ آخر ہے اگرچہ اس موضوع کے حوالے سے اور بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تاہم نارنگ کی تحقیق گراں

۱۔ گوپی چند نارنگ (مرتبہ) ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں ص ۳۶۳-۳۶۴

سب پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ نارنگ ہمیشہ سے شعر و ادب میں ان عناصر کے متلاشی رہے ہیں جو وسیع پیمانے پر افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ اجتماعی لاشعور کی گمشدہ حقیقتوں کے تانے بانے کا انکشاف نئے تخلیقی احساس کے ساتھ قاری پر ظاہر کرے۔ ان خیالات کو نارنگ نے "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" میں عملی جامہ پہنانے کے لیئے اردو مثنویوں کے عہد بہ عہد ارتقا پر روشنی ڈالی اور ہندوستانی موضوعات پر مثنویوں کو مختلف خانوں میں منقسم کیا اور سب سے پہلے مثنویوں کے بنیادی قصہ کا خاکہ پیش کیا اور پھر تحقیق و تجسس کے ساتھ اس کے قدیم ترین ہندوستانی ماخذات کا سراغ لگاتے ہیں۔ چونکہ تحقیق ایک نہایت صبر آزما کام ہے یہ نازک کام سانس آہستہ لینے کا تقاضا کرتا ہے اور آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری میں پروفیسر نارنگ نے کافی صبر و احتیاط سے کام لے کر اردو مثنوی کے موضوع سے بحث کر کے بہت سی نئی مثنویوں کو کھوج کر انہیں اردو دنیا سے متعارف کروایا۔ ڈاکٹر گیان چند جین جنہوں نے خود بھی اردو مثنویوں پر کافی عمدہ کام کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ کی اس تصنیف کے تیئں اپنا نقطۂ نگاہ یوں واضح کرتے ہیں :

"ڈاکٹر نارنگ نے غیر معمولی محنت سے یہ کتاب مرتب
کی ہے اور اردو مثنویوں پر ایک نئے اور اہم زاویہ
سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی مثنویوں
کا تعارف کرایا گیا ہے جن کے ذکر سے ہماری تاریخیں
خالی ہیں۔ زیر نظر کتاب اردو مثنوی سے متعلق تحقیقی
معلومات کا گنجینہ ہے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوگا۔" ؏۱

• سانحۂ کربلا بطورِ ایک شعری استعارہ

کربلا ازل سے ہی انسانی تاریخ کا ایک زندہ اور متحرک استعارہ رہا ہے۔ اگر کربلا کے لغوی معنی و مفہوم کی گہرائیوں میں جائیں تو اسکا سلسلہ انسان کی ان جبلتوں (HUMAN INSTINCTS) سے ملتا ہے جو رنج والم اور جور وستم سے عبارت ہیں۔ اسی لیے صرف انسانی علوم ہی نہیں ادب اور فن میں بھی غم اور رنج والم کی کیفیات کا اظہار کثرت سے ہوا ہے۔ اردو شاعری

؏۱ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں (از) گوپی چند نارنگ ص ۳۶۳

میں بھی ذات، حیات اور کائنات سے متعلق احساسات اور تجربات کا اظہار زیادہ ترنغم کے حوالے سے ہی کیا گیا ہے۔ لیکن کربلا ایک ایسا استعارہ ہے جس کو مذہبی نقطۂ نظر سے مخصوص معنی اور مفہوم کے جامے پہنائے جا سکتے ہیں تاہم کربلا کو بطور شعری استعارہ اردو شاعری میں کس طرح برتا گیا ہے اور اس استعارے کے استعمال اور برتاؤ سے شعر کے معنیاتی اور جمالیاتی نظام میں کون سی خوبیاں پیدا ہوئیں ہیں اسکا جائزہ پہلی بار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لیا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ اپنی تنقید میں اسلوبیات سے ساختیات تک مختلف تنقیدی نظریات اور رویوں کو بروئے کار لاتے ہیں اس لئے نارنگ کی تنقیدی تحریروں میں متن کی ساری خوبیاں اور خامیاں ایک ایک کر کے سامنے آجاتی ہیں۔ اپنی تصنیف "کربلا بطور ایک شعری استعارہ" میں ڈاکٹر نارنگ نے سانحۂ کربلا کی حیثیت اور معنویت کو نہ صرف مذہبی اور ایمانی اعتبار سے شدت سے محسوس کیا ہے بلکہ شعری سطحوں پر بھی سانحۂ کربلا کے اثرات کا حوالوں اور دلائل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ "سانحہ کربلا بطور ایک شعری استعارہ" میں نارنگ کا اسلوب بیان ایک لہو روتے ہوئے اسلوب

کی شکل میں سامنے آیا ہے اس کا اندازہ تصنیف کی ابتدائی سطروں سے ہی ہو جاتا ہے۔

"راہِ حق پر چلنے والے جانتے ہیں کہ صلوٰۃ عشق کا وضو، خون سے ہوتا ہے اور سب سے سچی گواہی خون کی گواہی ہے تاریخ کے حافظے سے بڑے بڑے شہنشاہوں کا جاہ و جلال، شکوہ و جبروت، شوکت و حشمت سب کچھ مٹ جاتا ہے لیکن شہید کے خون کی تابندگی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ بلکہ کبھی کبھی جب صدیاں کروٹیں لیتی ہیں اور تاریخ کسی نازک موڑ پر پہنچتی ہے تو خون کی سچائی پھر آواز دیتی ہے اور اس کی چمک میں نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ خون کی سچائی قائم و دائم ہے اور یہ ثقافتی روایت میں موجود بھی رہتی ہے۔ لیکن اس کی آواز کانوں میں اسی وقت آتی ہے۔ جب قوموں کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔" [1]

گوپی چند نارنگ نے اپنی تصنیف میں اس فقید المثال (RARE — EXAMPLE) استعارے کے مختلف العباد و جہات کو ذہن میں رکھتے

---

[1] سانحہ کربلا ایک شعری استعارہ (از) گوپی چند نارنگ۔ ص :

ہوئے اول تو سانحۂ کربلا کا پورا پس منظر پیش کیا ہے اور پھر اسے تاریخ انسانی کا ایک بے مثل سانحہ قرار دیتے ہوئے مذہبی کے علاوہ خالص انسانی (HUMENISTIC) نقطۂ نظر سے بھی اسکی اہمیت اور معنویت کو اُجاگر کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سانحۂ کربلا پر نارنگ سے پہلے کسی اور نے نہیں لکھا ہو لیکن ان سے پہلے کے سارے مطالعے مذہبی نوعیت کے تھے۔ پروفیسر نارنگ کی دَین (CONTRIBUTION) یہ ہے کہ انہوں نے تنقید کی تاریخ میں پہلی بار کربلا کو ایک شعری استعارہ کے لیطور دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے واضح طور پر لکھا ہے۔

" واقعۂ کربلا کے تاریخی حوالے کا استعاراتی اظہار غزل کی کلاسیکی روایت میں یقیناً ڈھونڈا جا سکتا ہے اور اسکی تلاش سعیِ لاحاصل نہ ہو گی۔ میر تقی میرؔ کا یہ شعر اس کا بین ثبوت ہے۔

شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہو
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا اُن سے ہو تو سلام کریں

یہاں تیغ سے مراد حسنِ محبوب بھی ہو سکتا ہے جو چشم و

ابروئے محبوب کے وار سہہ کر شخصیت مکمل ہوتی ہے، لیکن پہلے مصرعے میں شیخ، محراب، حرم، دوگانہ کچھ اور ہی فضا پیدا کرتے ہیں نیز "پہروں دوگانہ پڑھتے رہو" میں اس ظاہرداری پر جو باطنی اقدار سے خالی ہو، ہلکا سا طنز بھی ہے۔ اب دونوں مصرعوں کو ملا کر پڑھیئے، تو تیغ تلے کا سجدہ اور سلام کسی اور ہی طرف اشارہ کرتے ہیں اگرچہ پورے شعر میں واقعۂ کربلا یا اس کے کسی محترم کردار کا کوئی ذکر نہیں، لیکن ظاہرداری اور تیغ تلے کا سجدہ سلام کرنے سے جس تضاد کی فضا بندی ہوئی ہے۔ اس میں ذہن معاً اسی تاریخی واقعے کی طرف راجع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کرشمہ فن کے رمزیہ اور ایمائی رشتوں کی بدولت قائم ہوتا ہے۔

انہیں ایمائی رشتوں کی روشنی میں ذرا ذیل کے اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے۔

دست کش نالہ، پیش رو گریہ
آہ چلتی ہے یاں علم لے کر

زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا
ذرا اس سے سرِ حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے
ہم حلقِ بُریدہ ہی سے تقریر کریں گے
اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ
ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے"[1]

پروفیسر نارنگ نے لکھا ہے کہ یہ اشعار بظاہر عشقیہ شاعری کے اشعار ہیں لیکن ان میں جو الفاظ نالہ، گریہ، آہ وغیرہ استعمال ہوئے ہیں وہ سانحہ کربلا کے تہذیبی اثرات کے سبب ہیں اس اعتبار سے نارنگ صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ کلاسیکی دور سے ہی کربلا کو ایک شعری استعارہ کے طور پر استعمال کرنے کی روایت ملتی ہے، اسی طرح نارنگ صاحب نے اردو نظم میں بھی کربلا کے بطور شعری استعارہ استعمال کئے جانے کی روایت کی جڑوں کو تلاش کیا ہے لیکن واضح طور پر سانحہ کربلا اور شہادتِ حسینؓ کو نئی معنویت کے ساتھ استعمال کرنے کی مثالیں علامہ اقبالؒ نے نظموں میں ڈھونڈی ہے اس ضمن میں نارنگ صاحب

---

[1]

نے علامہ اقبال کی وہ فارسی نظم نقل کی ہے جس کا عنوان ہے "در معنیٔ حریت اسلامیہ و سرِ حادثۂ 'کربلا'" چونکہ اقبال کی یہ نظم کربلا کو بطور استعارہ استعمال کرنے کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے اس لئے اس نظم کو نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔ نظم اس طرح ہے۔

عشق را آرامِ جاں حریت است — ناقہ اش را ساربان حریت است
آں امامِ عاشقاں پورِ بتول — عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوتِ شبیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
برزمینِ کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطعِ استبداد کرد — موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد
بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
سرِ ابراہیم و اسمٰعیل بود — یعنی آں اجمال را تفصیل بود
رمزِ قرآں از حسین آموختیم — ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

شوکتِ شام و فرِ بغدا درفت   سطوتِ غرناطہ ہم از یادرفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز   تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیکِ دور افتادہ گاں
اشکِ ما بر خاکِ پاک او رساں ؎۱

اس کے علاوہ نارنگ نے علامہ کی تصنیفات مثلاً "زبورِ عجم" "جاوید نامہ" "رموزِ بے خودی" "بالِ جبریلؑ" اور "ارمغانِ حجاز" میں بھی کربلا کے حوالے سے اشعار کے استعمال یا پھر سانحۂ کربلا اور امام حسینؑ کی عظمت کے حوالے سے اشعار کی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں نارنگ نے اردو کے دوسرے شعراء مثلاً جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری منیر نیازی سے لے کر افتخار عارف تک متعدد شاعروں کے یہاں کربلا، شہادتِ حسین اور آلِ رسولؐ کے مصائب و مسائل کے بیان کی نشاندہی کی ہے یا پھر یہ بتایا ہے کہ ان شاعروں نے سانحۂ کربلا امام حسینؑ کی شہادت سے اثرات قبول کر کے اپنے شعری اظہار کو کس طرح عظمت بخشی ہے۔ اس اعتبار سے نارنگ کی تصنیف "سانحۂ کربلا بطور ایک شعری استعارہ" ایک نادر و

؎۱

بے مثل تصنیف ثابت ہوتی ہے۔ جس نے اردو تنقید کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ نارنگ کی اس شاندار تصنیف کے بارے میں حنیف کیفی نے اپنے مضمون "سانحۂ کربلا ایک شعری استعارہ: اردو تنقید کی ایک نئی جہت کا اشاریہ" میں اپنے نکتۂ خیال کو بجا طور پر یوں ابھارا ہے کہ:

"یوں تو آج کل اردو میں تنقید کے نام پر بہت سی چیزیں لکھی جارہی ہیں اور غزل کے شاعروں کی طرح اس میدان میں بھی "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" والا معاملہ نظر آتا ہے لیکن کچھ اہل نظر اب بھی ایسے ہیں جو "آبروئے شیوۂ اہلِ نظر" قائم رکھے ہوئے ہیں۔ نارنگ صاحب بھی ایسے ہی اہل نظر ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ جس سے تنقید کی ایک نئی جہت سامنے آئی ہے' اس کا بین ثبوت ہے۔"[ع۱]

● ۔ اسلوبیاتِ میرؔ

اسلوبیاتِ میرؔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یادگاری خطبہ ہے جو انھوں نے

ع۱ دیدہ ور نقاد' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (ترتیب وتزئین) ڈاکٹر شہزاد انجم۔ ص ۳۶۔

۱۹۸۴ء میں دیا تھا۔ بعد میں یہ خطبہ کتابی شکل میں اسلوبیاتِ میرؔ کے نام سے شائع ہوا اب اس کتاب کی حیثیت "میریات" کے سلسلے میں ایک معتبر تصنیف کی ہے۔

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے۔ نارنگ نے اپنے اس خطبہ/تصنیف میں میرؔ کا تنقیدی جائزہ اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ اسلوبیات میر میں پروفیسر نارنگ نے نقد میرؔ کا آغاز میر کے اسلوبیاتی نظام سے بحث کرتے ہوئے کیا ہے۔ اس خطبہ کے آغاز میں گوپی چند نارنگ نے سراج الدین خان آرزوؔ کے حوالے سے مرزا محمد رفیع سوداؔ کی غزل کا یہ مطلع نقل کیا ہے۔

چمن میں صبح جب اوس جگنو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

اور پھر روایت کے حوالے سے اسی زمین پر میرؔ کا فی البدیہہ شعر نقل کیا ہے۔

ع ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو اپنے تھام تھام لیا

ڈاکٹر نارنگ نے اسلوبیاتی نقطے سے " ذکر میر"، " نکاتِ شعراء

(میر تقی میرؔ) "تذکرہ ہندی" (مصحفیؔ) "گلشنِ ہند" (مرزا علی لطف) "گلشنِ بے خار (مصطفیٰ خان شیفتہ) اور" مقدمہ شعر و شاعری" (حالی) کے علاوہ عبدالحق اور اثر لکھنوی وغیرہ کے حوالے سے میرؔ کے اس مطلع کا سوداؔ کے مطلعے سے تقابل کرتے ہوئے پہلے تو میرؔ کے مطلعے کو سودا کے مطلعے سے بلند قرار دیا ہے اور پھر ان دونوں کا اسلوبیاتی جائزہ لیتے ہوئے گوپی چند نارنگ نے یہ نتائج اخذ کئے ہیں۔

> " سودا کا مطلع معمولی نہیں۔ چمن، صبا، صبح، تیغ، آبِ رواں میں معنوی اور صوتی نسبتیں ہیں نیز جنگجو کی رعایت سے صبا کا آبِ رواں سے تیغ کا کام لینا بھی خالی از لطف نہیں لیکن میرؔ کے مطلع میں دل کو چھو لینے والی جو کیفیت ہے، سودا کا مطلع اس سے خالی ہے۔ کیوں؟ شعر میں معنویت، تصویریت، کیفیت سب لفظوں ہی کے ذریعے پیدا ہوتی ہے اور زبان کا تخلیقی استعمال ہی شاعر کی اپج فطری جوہر، جوشِ جذبات اور زورِ تخیل کی بنیادی کلید فراہم کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس مطلع میں میرؔ کی فطری افتادنے

ان کے لہجے کو کس طرح یک لخت سودا سے الگ
کر دیا ہے۔"[1]

گوپی چند نارنگ نے ان دونوں مطلعوں کے حوالے سے میرؔ کے اسلوبیاتی نظام اور اس سے پیدا ہونے والی معنیاتی فضا کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :-

" علاوہ لفظ نام کے جو دونوں شعروں میں مشترک ہے سارے شعر میں صرف ایک اسم ہے 'دل ستم زدہ اور شعر کا پورا معنیاتی نظام اس میں ایک اسم کے گرد گھومتا ہے۔ اس سے معنی کی ترسیل اور کیفیت پیدا کرنے میں جو مدد ملتی ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ بادی النظر میں محسوس یہی ہوتا ہے کہ میرؔ نے بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور اس کا اعادہ ہماری میریات کی پوری تنقیدی روایت میں ہوتا رہا ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ غلط بات میرؔ کے اسلوب شعر کے بارے میں کہی

---

[1] "انشاء" کا گوپی چند نارنگ نمبر (مرتبہ) ف۔س۔ اعجاز ۲۰۰۴ء ص ۳۸۶

ہی نہیں جا سکتی اور اس سے بحث آگے آئے گی کہ میرؔ کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ میرؔ کا صرفی اور نحوی ڈھانچہ عام اردو کا ہے لیکن لفظوں کے سُر الگ ہیں۔ متعدد اسلوبیاتی امتیازات کے باعث میرؔ کا لہجہ ایسی شدید انفرادیت رکھتا ہے کہ میر کا شعر پڑھتے یا سنتے ہی فوراً محسوس ہوتا ہے کہ یہ لہجہ دوسروں سے الگ ہے"۔ [1]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے میرؔ کے لب و لہجے پر میر کی لفظیات کے حوالے سے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ :

"میر کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ فوری احساس یہی ہوتا ہے کہ وہ لہجۂ عام کے شاعر ہیں حالانکہ یہ نظر کا دھوکہ ہے، اور یہ سلسلہ دو صدیوں سے چل رہا ہے۔ اصلاً میرؔ کا آرٹ فریبِ نظر کی کیفیت رکھتا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس آرٹ پر آرٹ کا شائبہ نہیں ہوتا یعنی

---

[1] "انشاء" کا گوپی چند نارنگ نمبر (مرتبہ) ف، س، اعجاز ۲۰۰۴ء ص ۳۸۶۔۳۸۷

سادگی کے ساتھ میرؔ کی پُرکاری اس درجہ تہہ نشین ہے
کہ بظاہر سادہ ہی سادہ معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ میرؔ نے
بار بار تنبیہہ کی ہے۔:

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

میرؔ بار بار دعویٰ کرتے ہیں اگرچہ ان کو گفتگو عوام سے
ہے لیکن ان کے شعر خواص پسند ہیں"۔ ؎۱

ڈاکٹر نارنگ نے عام طور پر اردو تنقید کو جدید ترین نظریات اور تصورات سے متعارف کروانے کے اعتبار سے شہرت حاصل کی ہے۔ اس مقالے کے مختلف ابواب میں جدیدیت، مابعد جدیدیت اور خاص طور پر ساختیاتی اور فارسی اساس تنقید جیسے تنقیدی رویوں کو اردو میں متعارف کروانے کے سلسلے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں اسلوبیات میرؔ کے حوالے سے اس خیال کا اعادہ ضروری ہے کہ ابتداء سے ہی اسلوبیات کے حوالے سے اردو شعر و ادب کا جائزہ لیتے رہے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی مستقل تصنیفات مثلاً "اردو

؎۱ "انشاء" کا گوپی چند نارنگ نمبر (مرتبہ) ف س اعجاز ۲۰۰۴ء : ص ۳۸۷

غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب"، "سانحہ کربلا بطور ایک شعری استعارہ" وغیرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان تصنیفات میں نارنگ کے اسلوبیاتی طریقِ نقد پر دوسرے ابواب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید "اسلوبیاتِ میر" میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ تنقید کے اسلوبیاتی دبستان کے حوالے سے جتنی بھی تصنیفات سامنے آئی ہیں ان میں اسلوبیاتِ میر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

"اسلوبیاتِ میر" میں ڈاکٹر نارنگ نے میر کی ابتدائی غزلوں کی اسلوبیاتی خوبیوں سے بھی بحث کی ہے مثلاً یہ غزل :

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی، خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پہ یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جُبّہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ میرؔ کی یہ غزل ان کی ابتدائی غزلوں میں ہے اور پھر سید عبداللہ کے حوالے سے غالبؔ کی اسی زمین پر لکھی ہوئی غزل درج کی ہے۔ غالبؔ کی غزل یہ ہے۔:

وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیب دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا
عکسِ رُخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ
شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا
ساقی نے از بہرِ گریباں چاکئ موجِ بادۂ ناب
تارِ نگاہِ سوزنِ مینا رشتۂ خطِ جام کیا
مہر بجائے نامہ لگائی برلبِ پیکِ نامہ رساں
قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا
شام فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسدؔ
ماہ کو در تسبیح کواکب جائے نشینِ امام کیا

ڈاکٹر نارنگ نے ان دونوں غزلوں کے اسلوب کا موازنہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں غزلیں اپنے اپنے اسلوب کی نمایندہ ہیں۔ غالب کے مطلع میں اسماء اور اسمائے صفات نو ہیں: وحشی، صیاد، رم، خوردوں، رشتہ چاک، جیب دریدہ، قماش، دام، میرؔ کے گیارہ پہلے مصرعے میں تدبیریں اور دوا اور دوسرے میں بیماریٔ دل اور ان کی ساخت یوں ہے۔ تدبیرِ دل کا الٹا ہو جانا، دوا کا کام نہ کرنا اور بالآخر بیماریٔ دل کا کام تمام کرنا۔ آپ نے دیکھا شعر میں صرف تین اسماء ہیں اور تین نحوی اکائیاں ہیں اور ہر ایک کی تکمیل فعل سے ہوتی ہے۔ ان تینوں افعال کو "دیکھا" کے صرف سے جو بجائے خود ایک فعلیہ اکائی ہے۔ شاعر نے بیماریٔ دل کے آخر کام تمام کرنے کی معنویت کو پوری طرح راسخ کر دیا۔ غالبؔ کے یہاں دوسرے شعر میں دس اسماء ہیں، جبکہ میر کے یہاں ان کی تعداد بہت کم ہے بالعموم شعر کے دو مصرعوں میں دو نحوی واحدے ہوتے ہیں یا اگر ایک مصرعہ دوسرے

سے نحوی اعتبار سے جڑا ہوا ہو تو ایک ہی نحوی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میر کے یہاں ایسا نہیں، طویل بحر کی اس غزل میں تین تین چار چار نحوی ٹکڑے ملیں گے، الٹی ہو گئیں سب تدبیریں / کچھ نہ دوا نے کام کیا / دیکھا / اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا / اسی طرح / عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند / یعنی رات بہت تھے جاگے / صبح ہوئی آرام کیا / یہ پہلا خط امتیاز ہے جو میر اور غالب کے اسالیب کے بیچ کھینچا جا سکتا ہے۔ یعنی میر کی زبان میں اسما یا اسمائے صفت کی بھرمار نہیں"۔ ؎۱

میر اور غالب کی غزلوں کے اسلوبیاتی موازنے کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کلام میر کے بنیادی اسلوبیاتی امتیازات سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اسطرح سے کیا ہے:۔

۱۔ میر کے یہاں طویل بحروں میں بھی چھوٹے چھوٹے نحوی واحدے ہیں جو معنیاتی NODES کی طرح کام کرتے ہیں اور فوری ترسیل جذبات یا تاثیر

؎۱ "انشاء" کا گوپی چند نارنگ نمبر (مرتبہ) س۔ف۔ اعجاز ۲۰۰۴، ص ۲۹۱

میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

۲۔ اسما کی قلت و کثرت سے مضاف اور مضاف الیہ کا رشتہ اور اضافت کا کردار بھی متاثر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ سامنے کی بات ہے لیکن غیر اہم نہیں ہے۔

۳۔ اسلوب میر میں اُلٹی ہوگئیں، رو رو کاٹا، آنکھیں موند، ہاتھ میں لا کے چھوڑ دیئے۔ بھولے اس کے قول و قسم پر، وحشت کھونی، قشقہ کھینچا سے صاف ظاہر ہے کہ میرؔ کی زبان اپنی طاقت دھرتی کی گہرائیوں میں پیوست پراکرتوں کی جڑوں سے بھی حاصل کر رہی ہے۔

۴۔ میر کے یہاں مصوّتوں کا استعمال اور بالخصوص طویل مصوتوں کا استعمال دوسرے اصحابِ اسلوب شعرا کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ میرؔ کے یہاں قوتِ پرواز بھی زیادہ ہے اور گم شدگی، سپردگی اور حیرت و استعجاب کی کیفیتیں بھی لیکن زبان کے معاملے میں دھرتی سے ان کا رشتہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ موسیقی کے نظام کی طرح ہمارے عروضی نظام میں بھی یہ گنجائش ہے کہ زمانی وقفے تو مقرر ہیں لیکن آوازیں مقرر نہیں۔ چنانچہ مصوتوں کی تعداد فنکار کی تخلیقی قوت کے زیرِ اثر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس سے بحروں کے صرف میں شاعر کی انفرادی شان

اور انفرادی ترنم پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے عروضی نظام کی بنیاد صرف پر ہے۔ یہ مصمتوں اور طویل مصوتوں میں فرق نہیں کرتا۔ چنانچہ ہر بڑے شاعر کے یہاں ان کے صرف کی شان الگ ہی ملے گی۔ اس کا ثبوت میر کی مندرجہ بالا غزل کے ہر ہر شعر سے مل جاتا ہے یوں دیکھئے تو یہ خصوصیت پہلی بنیادی خصوصیت سے جڑی ہوئی ہے کیونکہ جہاں نحوی واحدے زیادہ ہونگے۔ طویل مصوتے بھی افعال کے در آنے سے لا محالہ زیادہ ہوں گے۔ اس بحث کے بعد اب میر کے اشعار کو کہیں سے بھی لیجئے اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان کی نحو پر بھی نظر رکھیئے ان میں نحوی واحدے کس کثرت سے ہیں اور انہیں کتنی آسانی سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

دل کی تہہ کی کہی نہیں جاتی / نازک ہے اسرار بہت
انچھر تو ہیں عشق کی دو ہی / لیکن ہے بستار بہت

خوب ہے اے ابر یک شب آؤ / باہم روئیے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر / کم کم روئیے

گلی میں اس کی گیا / سو گیا / نہ بھولا پھر
یں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی / پر اس کے گئے
ایسا اجڑا / کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

عشق ہمارا آہ نہ پوچھو / کیا کیا رنگ بدلتا ہے /
خون ہوا / پھر داغ ہوا / پھر درد ہوا / پھر غم ہے اب /

۵۔ میر جابجا میاں، پیارے، ارے صاحب، رے، کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے بجائے تم اور بعض جگہ بول چال کی بے تکلفی میں تم کے بجائے تو بھی لاتے ہیں۔ میرؔ، میر صاحب، میر جی بھی گفتگو میں تخاطب کے لیے خوب خوب استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری کا عام انداز یہ ہے گویا باتیں کر رہے ہیں۔

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

پیار کرنے کا جو خوباں ہم رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے
پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

کہتے ہو کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ نارنگ ایک ایسے منفرد نقاد ہیں جنہوں نے روایتی اور کلاسیکی سے لیکر جدید اور مابعد جدید ادبی روایات، شعریات اور نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی لئے نارنگ میر ہی نہیں کسی بھی

شاعر کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ایک طرف تو شاعری میں الفاظ کے لسانی برتاؤ (یعنی الفاظ کی نحوی سادگی، سہل ممتنع، عربی فارسی اور مقامی الفاظ کے لسانی برتاؤ) وغیرہ سے بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مغربی مفکرین اور زبان وادب سے متعلق نئے نظریات مثلاً سوسیئر کے نظریۂ لسان اور رولاں بارتھ کے نظریۂ ساختیات، دریدا کے نظریۂ تشکیل اور ردِ تشکیل وغیرہ کے بارے میں اپنی معلومات سے بھی استفادہ کیا ہے اس اعتبار سے میرؔ کو گرچہ کسی ایک عہد کا شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ میر تقی میرؔ کلاسیکی دور میں جتنے اہم شاعر مانے جاتے تھے آج مابعد جدید دور میں بھی اتنے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم شاعر تصور کئے جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرؔ کی دائمی معنویت کا اعتراف صرف پروفیسر گوپی چند نارنگ ہی نہیں کرتے بلکہ شمس الرحمان فاروقی نے بھی "شعر شور انگیز" لکھ کر میرؔ کی معنویت کے بارے میں نارنگ کے خیالات کی تصدیق کی ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو "شعر شور انگیز" "اسلوبیات میرؔ" کی ترقی یافتہ شکل ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ "اسلوبیات میرؔ" گرچہ ۱۹۸۴ء میں خطبے کی شکل میں وجود میں آئی لیکن آج پچیس سال بعد بھی "اسلوبیات میرؔ" میر تقی میرؔ کا سب سے اہم اور معتبر مطالعہ ہے۔

●۔(ب) گوپی چند نارنگ کے مضامین و مقالات

گوپی چند نارنگ کی تنقید ان تمام صفات سے مُزّین ہے جو اردو ادب و زبان کی ترقی و ترویج کے لیے بے حد لازمی قرار پاتے ہیں۔ ان کی تہہ دار تحریر کی جس پرت کو زیرِ غور لایا جائے اس میں جہانِ معنی کی ایک نئی کرن چمکتی دکھائی دے گی، جس کا ہر جلوہ، ہر زاویہ اور ہر نقطہ، ان کی فکر اور رسائی، ان کا طور طریقہ، رویہ اور عمل ذوقِ نگاہ کی تسکین کا سامان میسر کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کی ادبی و ثقافتی صورت حال کی روح کی موثر ترجمانی اور شاہراہِ ناآفریدہ کے لیے اسکا وجود ایک ناقابلِ فراموش حقیقت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ نارنگ نے پورے خلوص اور جگر کاوی کے ساتھ اپنے آپ کو ادب اردو کی ترقی کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے گرانقدر تصورات اور بے مثل محاسبات و تجزیات کو صفحہ قرطاسِ ادب پر یوں ابھارا کہ اردو ادب میں اپنے لئے بقائے دوام اور شہرت عام کے سرو سامان پیدا ہو گئے۔

زائد از نصف صدی پہلے جب گوپی چند نارنگ نے تاریخی اہمیت کے حامل دہلی کالج میں ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء میں داخلہ لیا تو بابائے اردو مولوی عبدالحق

(مرحوم و مغفور) جو اس زمانے میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر واقع دریا گنج میں دکنیات کے مدرّس تھے اس وقت پاکستان جا چکے تھے اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی تازہ دم ہجرت کی تھی اور صرف خواجہ احمد فاروقی تھے جو اس زمانے میں "میر تقی میر : حیات اور شاعری" کے موضوع پر کام کرتے تھے۔ نارنگ جیسے نوجوان رفیق کا میسّر آنا دلی کالج میں ایک نئی روح پھونک گیا۔ ان کی آمد نے دلی کالج میں ایک تحرک پیدا کیا اور سال بھر کے اندر اندر ہی ایک نہایت جامع اور ضخیم "دلی کالج نمبر" شایع ہوا جس کی معاونت اور ادارت کے فرائض گوپی چند نارنگ نے بحسن خوبی انجام دیئے۔ ڈاکٹر نارنگ کے پہلے دو مضامین کی اشاعت اسی نمبر میں ہوئی۔ یہی وہ زمانہ بھی تھا جب نارنگ نے نجیب اشرف ندوی کی فرمائش پر احمد آباد میں منعقدہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس (A.I.O.C) کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور "اردو شاعری میں اتحاد پسندی کے رجحانات" کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا (جو بعد میں "نوائے ادب" ممبئی میں دو قسطوں میں شائع ہوا) یہی زمانہ نارنگ اور "نگار" والے نیاز کے مراسم شروع ہونے کا بھی تھا۔ اسی زمانے میں نارنگ کا مقالہ "اکبر الہ آبادی : ہندوستان اور پاکستان کی نظر میں" نیاز فتحپوری

کے رسالہ نگار میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نارنگ عملی کام کے ساتھ ساتھ اپنے سینئر معاصرین کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ ۱۹۵۴ء کے بعد نارنگ ایم اے کرنے کے بعد تازہ تازہ شاہراہِ ادب پر گامزن ہو رہے تھے اور ۱۹۵۷ء میں ان کی مرتبہ "معراج العاشقین" منظر عام پر آکر دادِ تحسین حاصل کر چکی تھی یہی وہ زمانہ تھا جب ترقی پسندی کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ دہلی سے "شاہراہ" نکلتا تھا اور رسالہ "صبا" حیدرآباد" "سوغات" بنگلور "ہماری زبان" علی گڑھ اور ان سے کچھ پہلے پاکستان کے رسائل "ادبی دنیا"، "سات رنگ"، "سویرا"، اور "نصرت" وغیرہ جدیدیت کا پیغام دینے لگے تھے۔ نارنگ کی طبیعت نے اس زمانے کی مایہ ناز شخصیات فراق گورکھپوری، آل احمد سرور اور محمد حسن عسکری سے بھی اثرات بھی قبول کئے۔ ۱۹۵۸ء میں اپنا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد وہ لسانیات کی طرف بھی راغب ہوئے۔ ۱۹۶۱ء تک لسانیات پر ڈاکٹر نارنگ کی دو منفرد کتابیں زیرِ عنوان" اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" اور" دہلوی اردو کی کرخنداری بولی" زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ کے ذہن کی بالیدگی انہیں اردو ادب کے ہر حلقے میں لے گئی۔ نارنگ کے بعض تنقیدی مضامین مثلاً

"عظمت اللہ خان : طرز مثنوی کا پرستار" اور" جوش اور فراق کا جمالیاتی احساس" وغیرہ شایع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر رہے تھے ہر چند کہ بحیثیت محقق اور ماہر لسانیات کے بھی ۱۹۶۵ء کے بعد دو برس کا وقت انہوں نے ہندوستان میں گزارا اور اس دوران انجمن ترقی دہلی (شاخ) کی فرمائش پر "مثنورات (کیفی)" کو ترتیب دیا علاوہ ازیں وسکانسن یونیورسٹی کے ریڈر پروجیکٹ کی تکمیل بھی کی پھر ۱۹۶۸ء میں وسکانسن یونیورسٹی نے مدعو کیا اور بیرونِ ہندوستان چلے گئے۔ لیکن اس دوران انکی طبیعت دو ایسے مضامین کی طرف مائل ہو گئی کہ علمی دنیا میں فکشن کے نقاد کی حیثیت سے انہوں نے اپنا لوہا منوایا اور یہ دو مضامین تھے "اردو کا علامتی اور تجریدی افسانہ" جسے نارنگ نے ۱۹۶۷ء میں رقمطراز کیا اور جو کچھ عرصہ بعد" شب خون" کی زینت بنا۔ دوسرا مضمون "راجندر سنگھ بیدی کا فن : استعاراتی اور اساطیری جڑیں" کے عنوان سے ۱۹۶۸ء میں نارنگ کے قلم سے نکلا۔ ان دو مضامین کے درمیانی وقفہ میں یعنی موخر الذکر مضمون کے کچھ ہی عرصہ پہلے "شہریار : اسم اعظم" کے موضوع پر ان کا ایک مضمون "نقوش" میں چھپ چکا تھا۔ اسے بھی تنقیدی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جا چکا تھا۔ نہ صرف اردو میں بلکہ انگریزی اور ہندی میں بھی نارنگ کے

مضامین و مقالات کی ایک اچھی خاصی تعداد ان کے قلم سے نکلتی رہتی تھی۔
ان کا ایک جامع انگریزی مقالہ "TRADITIONAL AND
INNORATION: THE POETRY OF FIRAQ & FAIZ" بھی
اسی زمانے کی پیداوار ہے، یہ مقالہ بھی ادبی و علمی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔
اسی طرح نارنگ سے لاتعداد انٹرویوز لئے گئے اور یہ مضامین، مقالات،
اداریے دیبرہ وغیرہ تا حال ادبی و علمی، تصانیف و رسائل اور جرائد و اخبارات
وغیرہ کی رونق میں اضافے کرتے رہتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ عالمگیر ادبی انجمنوں میں شریک ہوتے ہیں۔ نارنگ
کی ادبی سیمناروں میں شمولیت برصغیر میں ہی نہیں بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی
اردو کی ادبی محفلوں کی خوش بختی سمجھی جاتی ہے۔ نارنگ نے بیرونی سیمناروں
میں شمولیت کرکے اردو زبان و ادب کے جو بال و پر سنوارے ہیں اس کا ثبوت
ENCYCLOPEDIA OF INDIAN LITERATURE کے VOL. III
میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بجا طور پر ملتا ہے کہ :

A WIDELY TRAVELLED PERSON,

HE HAS DELIVERED LECTURESAT

THE UNIVERSITIES OF LONDON, PRAGUE, CHICAGO, BERKELEY, LOS ANGLES COLUMBIA, ARIZONA, COLORADA MINNESOTA, CORNELL, PENNSYLVANIA, MC GILL & TORONTO, A NOTED BROADCASTER & TELECASTER, NARANG IS ACCLAIMED FOR HIS CONTRIBUTION TO THE URDU LITERACY STUDIES." [1]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ آئے دن ادبی تقاریب، مذاکروں، مباحثوں، مکالموں، سیمناروں اور کانفرنسوں کی شان بڑھاتے ہیں۔ اور صدر ساہتیہ اکادمی کی حیثیت سے قومی اور بین الاقوامی سیمناروں کا انعقاد بھی کرتے رہتے ہیں۔

ذیل میں حتی الامکان کچھ ایسے مضامین و مقالات وغیرہ کو تاریخی ترتیب سے

1- ENCYCLOPEDIA OF INDIAN LITERATURE VOL. III SAHITYA ACCADEMY NEWDELHI (P. NO. 2885)

ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر نارنگ کے صرف وہ مضامین و مقالات ہیں جو ابھی تک کتابی صورت میں سامنے نہیں آئے ہیں۔ کیونکہ پروفیسر نارنگ کے جو مقالات کتابوں اور رسائل کے خصوصی شماروں میں جمع ہو گئے ہیں انکی تعداد کافی ہے ان میں پروفیسر نارنگ کی ریڈیائی تقاریر، بحث و مباحث، انٹرویوز، ٹیلی ویژن پروگرام مضامین و مقالات وغیرہ کثیر تعداد میں موجود ہے کہ مشکل سے ان کا شمار کیا جا سکتا ہے لہٰذا یہاں پر صرف شائع شدہ مقالات و مضامین وغیرہ کی منتخب کتابیات کو ہی پیش کیا جاتا ہے (ممکن ہے یہ مقالات کتابی صورتوں میں جلد شائع ہو جائیں)

نمبر شمار	عنوان	کتاب/رسالہ	مقام	سنہ اشاعت
۱۔	ایک نادر خط (قدیم دہلی کالج کے سلسلے میں) قدیم دہلی کالج نمبر (مرتبہ) خواجہ احمد فاروقی گوپی چند نارنگ ۔	دہلی کالج میگزین	دہلی	۱۹۵۳ء
۲۔	دہلی کالج کے چند پرنسپل قدیم دہلی کالج نمبر (مرتبہ) خواجہ احمد فاروقی گوپی چند نارنگ / شرنگر۔ بوتر وٹیلر	ایضاً	ایضاً	ایضاً

۳-	اردو غزل اور ہندوستانیت پہلا قسط	آجکل	دہلی	نومبر ۱۹۵۴ء
	اردو غزل اور ہندوستانیت	ایضاً	"	دسمبر ۱۹۵۴ء
۴-	اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات پہلا قسط	نوائے ادب	ممبئی	جنوری ۱۹۵۵ء
	اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات	ایضاً	"	اپریل ۱۹۵۵ء
۵-	جوش ملیانی کا رنگ سخن	اردو ادب	علی گڑھ	جون ۱۹۵۵ء
۶-	اردو کا مسئلہ	ہماری زبان	"	"
۷-	اردو نظم کا مستقبل	آج کل	دہلی	ستمبر ۱۹۵۵
۸-	اردو کے شاعروں اور ادیبوں سے	ہماری زبان	دہلی	ستمبر ۱۹۵۵ء
۹-	برائے عقل و دانش	ایضاً	ایضاً	دسمبر ۱۹۵۶ء
۱۰-	عظمت اللہ خان : طرز مثنوی کا پرستار	نقوش	لاہور	۱۹۵۹ء
۱۱-	حدیث خودی بطور نوشت سوانح حیات (مقدمہ)		امرتسر	۱۹۵۹ء
۱۲-	ایک غیر معروف مثنوی نگار: گلدستہ مسرت	نگار	لکھنو	۱۹۶۰ء

۱۳-	مثنوی مورنامہ : میر تقی میر	ماہ نو	کراچی	۱۹۶۰ء
۱۴-	اردو غزل میں رادھا اور کرشن کی تمثیل	آندھرا پردیش	حیدرآباد	۱۹۶۰ء
۱۵-	اردو غزل اور دکن	سب رس	حیدرآباد	۱۹۶۰ء
۱۶-	غالبؔ اور حادثۂ اسیری (ایک معاصر شہادت اور تاریخ)	نقوش	لاہور	۱۹۶۱ء
۱۷-	غالب کی صد سالہ برسی (غالب نمبر) دہلی یونیورسٹی	اردوئے معلیٰ	دہلی	۱۹۶۱ء
۱۸-	اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو (لسانیات نمبر) دہلی یونیورسٹی	ایضاً	"	۱۹۶۱ء
۱۹-	غالب کا ایک نیا خط (غالب نمبر) دہلی یونیورسٹی	ایضاً	"	۱۹۶۱
۲۰-	اردو میں صوتیاتی اصطلاحیں	ہماری زبان	علی گڑھ	جولائی ۱۹۶۲ء
۲۱-	قدیم اردو شاعری کا معاشرتی پس منظر	شیرازہ	سرینگر	ستمبر ۱۹۶۲ء
۲۲-	اردو رسم الخط : ایک بحث	پگڈنڈی	امرتسر	ستمبر ۱۹۶۲ء

۲۳۔	سلونوں کی تہذیبی اہمیت (قسط اول)	ہماری زبان	دہلی	اگست ۱۹۶۲ء
	ایضاً (قسط دوم)	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۲۴۔	ایک چادر میلی سی : جائزہ	نقوش	لاہور	اکتوبر ۱۹۶۲ء
۲۵۔	اردو شاعری اور وطنیت	صبح	دہلی	۱۹۶۲ء
۲۶۔	اردو غزل اور ہندوستانی فلسفہ	دہلی یونیورسٹی گزٹ	دہلی	۱۹۶۳ء
۲۷۔	موجودہ ہنگامی حالات اور ادیب	صنم	پٹنہ	مارچ ۱۹۶۳ء
۲۸۔	گاندھی اور نہرو کی راہ : جائزہ	سب رس	حیدرآباد	مارچ ۱۹۶۳ء
۲۹۔	ادیب اور شاعر کا فرض کیا ہے؟	ساقی	کراچی	مئی ۱۹۶۳ء
۳۰۔	کلیاں اور کانٹے : پیش لفظ ملک ہندی		بدایوں	۱۹۶۳ء
۳۱۔	دو ادبی اسکول (از علی جواد زیدی) جائزہ	آجکل	دہلی	۱۹۶۴ء
۳۲۔	مثنوی لورک چندا	نوائے ادب	ممبئی	اکتوبر ۱۹۶۴ء
۳۳۔	ن پان : قسط اول	ہماری زبان	علی گڑھ	فروری ۱۹۶۵ء
۳۴۔	اردو گھر سے باہر	سب رس	حیدرآباد	مئی ۱۹۶۵ء
۳۵۔	بات کرنے میں گزرتی ہے۔	ہماری زبان	علی گڑھ	جولائی ۱۹۶۵ء

۳۶۔	اردو نثر نگاری کے جدید رجحانات	ہم قلم	کراچی	۱۹۶۶ء
۳۷۔	امریکہ میں اردو	قومی زبان	کراچی	۱۹۶۶ء
۳۸۔	اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر انجمن اساتذہ اردو (ہند)	مشمولہ (مقالات)	دہلی	۱۹۶۷ء
۳۹۔	ہمزہ کیوں (تین قسطوں میں)	ہماری زبان	علی گڑھ	یکم ۸ اور ۱۵ مئی ۱۹۶۷ء
۴۰۔	اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت	نقوش	لاہور	ستمبر ۱۹۶۷ء
۴۱۔	منوہر لال شارب کی شاعری	مشمولہ وجدان	حیدرآباد	۱۹۶۷ء
۴۲۔	مہر ونامہ ۔ تبصرہ	سب رس	حیدرآباد	اپریل ۱۹۶۸ء
۴۳۔	کربل کتھا کا لسانی تجزیہ	رسالہ اردو	کراچی	۱۹۶۸ء
۴۴۔	اردو شاعری میں جمہوریت اور سوشلزم کا تصور	آجکل	دہلی	جولائی ۱۹۶۸ء
۴۵۔	حسن ولوذر (پیش لفظ)	بلجیت سنگھ	دہلی	۱۹۸۶ء
۴۶۔	اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی	مشمولہ نذر ذاکر	دہلی	۱۹۶۸ء
۴۷۔	امریکہ اور کینڈا کے کتب خانوں میں اردو مخطوطات	اردو ادب	علی گڑھ	۱۹۶۸ء

۴۸۔	اردو غزل میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا	پگڈنڈی (غزل نمبر)	امرتسر	۱۹۶۸ء
۴۹۔	جدید اردو افسانہ (گوپی چند نارنگ کے انگریزی مضمون سے ترجمہ) از آفاق احمد	شیرازہ	سرینگر	۱۹۶۸ء
۵۰۔	سرور جہاں آباد کی شاعری: پیش لفظ	سرور جہاں آبادی - حیات اور شاعری	لکھنؤ	۱۹۶۸ء
۵۱۔	اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) اور غالب: غالب نام آورم	انجمن ترقی اردو پاکستان	کراچی	۱۹۶۹ء
۵۲۔	غالب اور خودداری	صحیفہ	لاہور	۱۹۶۹ء
۵۳۔	ڈاکٹر بارکر کی اردو کتابیں: تبصرہ	رسالہ اردو	کراچی	۱۹۶۹ء
۵۴۔	جوش ملیانی کا رنگ سخن	کتاب نما (جوش ملیانی نمبر)	نئی دہلی	مئی ۱۹۶۹ء
۵۵۔	کچھ جدید افسانے کے بارے میں	شب خون	الہ آباد	فروری ۱۹۷۰ء
۵۶۔	اردو میں لسانی تحقیق	نوائے ادب	ممبئی	۱۹۷۰ء
۵۷۔	محمد قلی قطب شاہ	سب رس	حیدرآباد	جنوری ۱۹۷۱ء
۵۸۔	گلِ بکاولی و گلشن نگاریں	شب خون	الہ آباد	مارچ ۱۹۷۱
۵۹۔	اردو مثنوی شمالی ہند میں از گیان چند جین (تبصرہ)	آجکل	نئی دہلی	اکتوبر ۱۹۷۱ء

۶۰۔	گلِ رعنا۔ تبصرہ	ہماری زبان	نئی دہلی	۱۹۷۱ء
۶۱۔	اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی	ارمغانِ مالک	دہلی	۱۹۷۱ء
۶۲۔	اردو رسم الخط تہذیبی اور لسانیاتی مطالعہ	رسالہ جامعہ	دہلی	۱۹۷۱ء
۶۳۔	اردو غزل میں ہندوستانی تلمیحات	سیکولر ڈیموکریسی	دہلی	۱۹۷۲ء
۶۴۔	کلیات ممنون: ایک جائزہ (تبصرہ)	ایضاً	دہلی	فروری ۱۹۷۳ء
۶۵۔	اردو افسانہ نگاری — (انٹرویو)	سیاست	حیدرآباد	فروری ۱۹۷۳ء
۶۶۔	انتخاب محمد قلی قطب شاہ (تبصرہ)	سیکولر ڈیموکریسی	دہلی	مارچ ۱۹۷۳ء
۶۷۔	ژاژ: ایک طویل نظم (تبصرہ)	کتاب نما	دہلی	اکتوبر ۱۹۷۳ء
۶۸۔	اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت اور "ہمزہ کیوں؟"	اردو میں لسانی تحقیق	ممبئی	۱۹۷۳ء
۶۹۔	اردو کا المیہ: ایک جائزہ	ہماری زبان	دہلی	۱۹۷۳ء
۷۰۔	جلیس: پیش لفظ	انور کمال حسینی	دہلی	۱۹۷۳ء
۷۱۔	جہان آزاد بطورِ ادیب (رفعت سروش)	مشمولہ جہان آزاد	دہلی	۱۹۷۳ء
۷۲۔	اردو کی ہندوستانی بنیاد	آل انڈیا اردو کانفرنس	دہلی	۱۹۷۴ء
۷۳۔	خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں	ہماری زبان	دہلی	مئی ۱۹۷۴ء

۷۴۔	چوپٹ راجا از فکر تونسوی (تبصرہ)	کتاب	لکھنؤ	جولائی ۱۹۷۴ء
۷۵۔	اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک	ہندوستانی زبان	ممبئی	جنوری اپریل ۱۹۷۴ء
۷۶۔	اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہہ	مشمولہ نذر عابد	دہلی	۱۹۷۴ء
۷۷۔	کچھ سرلا دیوی کے بارے میں	ہماری زبان	دہلی	جون ۱۹۷۵ء
۷۸۔	انجمن (تبصرہ)	ایضاً	"	نومبر ۱۹۷۵ء
۷۹۔	پرانوں کی اصلیت اور معنویت	ہماری زبان		نومبر ۱۹۷۵ء
۸۰۔	اردو شاعری میں سانٹ: ڈاکٹر حنیف کیفی (پیش لفظ)		دہلی	۱۹۷۶ء
۸۱۔	اپنی اپنی صلیب — صالحہ عابد حسین (تبصرہ)	آجکل	دہلی	۱۹۷۶ء
۸۲۔	ایم اے اردو کے نصابات پر ایک نظر۔	صبح ادب	لکھنؤ	مئی ۱۹۷۶ء
۸۳۔	غالب اور شاہانِ تیموریہ — ڈاکٹر خلیق انجم (تبصرہ)	سب ساتھ	دہلی	مئی ۱۹۷۶ء
۸۴۔	فکر تونسوی: دھرتی کا باسی	گفتگو	ممبئی	جون ۱۹۷۶ء

۸۵۔	اسماعیل میرٹھی کی شاعری : حیات اسمٰعیل (پیش لفظ)	سیفی پریمی	دہلی	۱۹۷۶ء
۸۶۔	خواجہ غلام السیدین اور السان دوستی	جامعہ	دہلی	۱۹۷۶ء
۸۷۔	احتشام حسین کی لسانی خدمات	شب خون	الہ آباد	اگست ۱۹۷۷ء
۸۸۔	اردو ادیب مسائل کے دھوئیں میں	سطور	دہلی	ستمبر ۱۹۷۷ء
۸۹۔	ایضاً ″	آجکل	دہلی	ستمبر ۱۹۷۷ء
۹۰۔	″غالب اور تصوف″ سید محمد مصطفےٰ صابری (پیش لفظ)	کلکتہ		۱۹۷۷ء
۹۱۔	″شہزاد سنگ″ بلراج کومل (تبصرہ)	ہماری زبان	نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۹۲۔	شجر صدا : نئی منزل کی تلاش میں	ایضاً	″	۱۹۷۷ء
۹۳۔	اک الگ ہٹ کے نشان کف پا، مشمولہ ″کرب آگہی″	آنند نرائن ملا	دہلی	۱۹۷۷ء
۹۴۔	اردو کا حال و مستقبل	سیاست	حیدرآباد	جنوری ۱۹۷۸ء
۹۵۔	شاد عارفی : شخصیت اور فن ــــ ڈاکٹر مظفر حنفی (تبصرہ)	ہماری زبان	دہلی	جون ۱۹۷۸ء

۹۶۔	کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔ خلیل الرحمٰن اعظمی	ہماری زبان	دہلی	اگست ۱۹۷۸ء
۹۷۔	چند لمحے بیدی کی نئی کہانی کے ساتھ انظہار: ایک باپ بکاؤ ہے۔		ممبئی	۱۹۷۸ء
۹۸۔	اردو ادیب کے مسائل (مشمولہ: اردو طباعت واشاعت کے مسائل)		دہلی	۱۹۷۸ء
۹۹۔	خطبہ کل ہند اردو کانفرنس	ہماری زبان	دہلی	مارچ ۱۹۷۹ء
۱۰۰۔	نظیر اکبر آبادی: تہذیبی دیدباز	مشمولہ: نظیر نامہ شمس الحق عثمانی	دہلی	۱۹۷۹ء
۱۰۱۔	اردو زبان کی ترویج ومقبولیت میں آل انڈیا ریڈیو کی خدمات	ہماری زبان	دہلی	مارچ ۱۹۸۰ء
۱۰۲۔	اردو مسائل اور ذمہ داریاں" ایضاً	NBT مشمولہ روداد سیمینار روداد سیمینار روداد یک ٹرسٹ لکھنؤ	جے پور	اپریل ۱۹۸۰ء
۱۰۳	سہیل عظیم آبادی: رفتید ولے نہ از دل ما	ہماری زبان	دہلی	نومبر ۱۹۸۰ء

۱۰۴۔	اردو اور ہندی کا رشتہ	مشمولہ نذر زیدی	دہلی	۱۹۸۰ء
۱۰۵۔	ادب کا اسلوبیاتی مطالعہ	مشمولہ اسالیب	پٹنہ	۱۹۸۰ء
۱۰۶۔	مظفر حنفی کی غزل (پیش لفظ)	طلسم حرف	الہ آباد	۱۹۸۰ء
۱۰۷۔	ادب کی سماجیت کی اجارہ داری	تناظر	دہلی	۱۹۸۰ء
۱۰۸۔	کالی داس گپتا رضا: دیار شاعری میں	شعاع جاوید	دہلی	۱۹۸۰ء
۱۰۹۔	بہار کا تاریخی اقدام	ہماری زبان	دہلی	جنوری ۱۹۸۱ء
۱۱۰۔	اردو ہماری اردو۔ دوسری غیر مسلم اردو کانفرنس	خطبۂ صدارت	لکھنؤ	اپریل ۱۹۸۱ء
۱۱۱۔	ڈاکٹر ذاکر حسین: دانائے راز	روزنامہ قومی آواز	دہلی	مئی ۱۹۸۱ء
	ایضاً	عظیم آباد ایکسپریس	پٹنہ	" "
۱۱۲۔	اردو ہماری صدیوں کی کہانی	ایضاً	"	" "
۱۱۳۔	اردو ہماری اردو	ہماری زبان	دہلی	ستمبر ۱۹۸۱ء
۱۱۴۔	کھُل جا سم سم (تبصرہ)	ایضاً	دہلی	دسمبر ۱۹۸۱
۱۱۵۔	عالمی اردو کانفرنس کلیدی خطبہ	پاسبان	چنڈی	فروری ۱۹۸۲
۱۱۶۔	گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے	قومی آواز	دہلی	مارچ ۱۹۸۲ء

۱۱۷۔	رادار مجموعۂ کلام ساقی فاروقی (پیش لفظ)		دہلی	۱۹۸۲ء
۱۱۸۔	عثمان عارف کی شاعری	مشمولہ مجموعۂ کلام نورِ زندگی	"	"
۱۱۹۔	خطبات محمد ہدایت اللہ: تقریر و تعبیر	زبان و ادب	پٹنہ	اپریل ۱۹۸۳ء
	ایضاً	جامعہ	دہلی	جولائی ۱۹۸۳ء
۱۲۰۔	جامعہ اسلامیہ ادبی و تحقیقی روایت	ہماری زبان	دہلی	دسمبر ۱۹۸۳ء
۱۲۱۔	نئی غزل کا جوانا مرگ شاعر: بانی	مشمولہ مجموعۂ کلام شفق شجر	"	۱۹۸۳ء
۱۲۲۔	شعر حسرت کی سیاسی جہت: نظرِ ثانی کی ضرورت	اوراق	سرگودھا	جولائی ۱۹۸۴ء
۱۲۳۔	سرمد کی شاعری (مقدمہ)	مجموعہ کلام سحر سرمد	دہلی	۱۹۸۴ء
۱۲۴۔	اردو رسم الخط بدیسی نہیں	قومی آواز	لکھنؤ	مارچ ۱۹۸۵ء
۱۲۵۔	ایک جذباتی خط: در جواب ڈاکٹر ظ۔ انصاری	بیسویں صدی: خاص نمبر	دہلی	۱۹۸۵ء
۱۲۶۔	کرشن چندر اور ان کے افسانے	مشمولہ کرشن چندر کے افسانے	علی گڑھ	۱۹۸۶ء

۱۲۷۔	امیر خسرو : ایک تاثر	مستقبل	دہلی	اپریل ۱۹۸۶ء
۱۲۸۔	پیر مغان ہے مردِ خلیق: آل احمد سرور	ہماری زبان	دہلی	مئی ۱۹۸۶
۱۲۹۔	سبز جڑوں کی شاعری : حبیب جالب	ایضاً	دہلی	نومبر ۱۹۸۶ء
۱۳۰۔	مالک رام : رہروِ راہِ غالب	مشمولہ مالک رام ایک مطالعہ	دہلی	۱۹۸۶ء
۱۳۱۔	برق۔ شاگردِ داغ (مقدمہ)	مشمولہ "جلوہ طور"	بنگلور	۱۹۸۷ء
۱۳۲۔	زورِ صید افگن	ہماری زبان	نئی دہلی	اکتوبر ۱۹۸۷ء
۱۳۳۔	فکر تونسوی : دھرتی کا باسی (مشمولہ فکری تونسوی حیات اور کارنامے)	شمع افروز زیدی	نئی دہلی	۱۹۸۸ء
۱۳۴۔	احمق پھپھوندوی کی مزاح نگاری	روزنامہ منصف	حیدر آباد	۱۹۸۸ء
۱۳۵۔	گنیش بہاری طرز کی شاعری	فن و شخصیت	بمبئی	۱۹۸۹ء
۱۳۶۔	ساختیات اور ادبی تنقید	ماہِ نو	لاہور	جون ۱۹۸۹ء
	ایضاً	شعر و حکمت	حیدرآباد کتاب ۲	۱۹۹۰ء
۱۳۷۔	غالب کا جذبۂ حب الوطن اور سنہ ستاون ڈاکٹر تنویر احمد علوی	مشمولہ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق	دہلی	۱۹۹۰ء

۱۳۸۔	مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات	فکر و نظر	علی گڑھ	شمارہ: ۱۔ ۱۹۹۰ء
۱۳۹۔	رولاں بارتھ پس ساختیات کا پیش رو	صریر	کراچی	جنوری ۱۹۹۰ء
۱۴۰۔	کچھ ساختیات کے بارے میں	ایضاً	کراچی	فروری ۱۹۹۰ء
۱۴۱۔	ژاک دریدا	ایضاً	"	اپریل ۱۹۹۰ء
۱۴۲۔	ساختیات اور بوئے گل کا سراغ (مہمان اداریہ)	کتاب نما	دہلی	جولائی ۱۹۹۰ء
۱۴۳۔	روسی ہیئت پسندی	اوراق	سرگودھا	اگست ۱۹۹۰ء
۱۴۴۔	ساختیات	صریر	کراچی	ستمبر ۱۹۹۰ء
۱۴۵۔	ساختیاتی تنقید پر ایک خط	ایضاً	"	دسمبر ۱۹۹۰ء
۱۴۶۔	بارتھ نے کہا تھا	شب خون	الہ آباد	مئی ۱۹۹۱ء
″	ایضاً	صریر	کراچی	مئی ۱۹۹۱ء
۱۴۷۔	ساختیات اور شعریات: رومن جیکب	دریافت	کراچی	جولائی ۱۹۹۱ء
۱۴۸۔	سنسکرت شعریات اور ساختیاتی فکر	آجکل	دہلی	جنوری فروری ۱۹۹۲ء
۱۴۹۔	آنا دریدا کا پھر صد لیۂ لسان میں اور کرنا ملاقات معنی آرا سے	دریافت	کراچی	مارچ ۱۹۹۲ء

۱۵۰-	قاری اساس تنقید (تین قسطوں میں)	صریر	کراچی	جون ۱۹۹۲ء
۱۵۱-	ادیبوں کے لطیفے (پیش لفظ)	نازنگ ساقی	دہلی	۱۹۹۲ء
۱۵۲-	نغمۂ حیات (پیش لفظ)	مجموعہ دھرمیندر ناتھ	دہلی	۱۹۹۳ء
۱۵۳-	کلیات کنور مہندر سنگھ بیدی (پیش لفظ)	نازنگ ساقی	دہلی	۱۹۹۳ء
۱۵۴-	خلیل الرحمٰن راز (پیش لفظ)	مجموعہ سانٹ	دہلی	۱۹۹۳ء
۱۵۵-	مارکسیت سے مکالمہ جاریہ	قومی آواز	دہلی	اپریل ۱۹۹۳ء
۱۵۶-	پرٹی الیکٹن	اقدار	کراچی	جون ۱۹۹۳ء
۱۵۷-	دریدا اور مارکسیت	طلوع افکار	کراچی	جولائی ۱۹۹۳ء
۱۵۸-	تنقید کے نئے ماڈل کی جانب	دریافت	〃	دسمبر ۱۹۹۳ء
۱۵۹-	پیش لفظ: نرمان مجموعۂ کلام	انتخاب نسیم	لاہور	۱۹۹۴ء
۱۶۰-	پیش لفظ: گیان سنگھ شاعر	سوانحی ناول	دہلی	۱۹۹۴ء
۱۶۱-	پیش لفظ: قتیل شفائی	انتخاب کلام	〃	۱۹۹۴ء
۱۶۲-	پیش لفظ: فرحت زاہد	مجموعہ کلام	کراچی	۱۹۹۴ء
۱۶۳-	نئی سوچ نئے مباحث	قومی آواز	دہلی	جنوری ۱۹۹۴ء
۱۶۴-	پس ساختیات: پیش لفظ	دستک	ہوڑہ	اپریل ۱۹۹۴ء

۱۶۵۔	مابعد جدیدیت: کیا اور کیوں؟	ایوان اردو	دہلی	جون ۱۹۹۴ء
	ایضاً	نقوش	لاہور	شمارہ ۱۷۱ ۱۹۹۴ء
۱۶۶۔	ساختیات اور پس ساختیات	اوراق	سرگودھا	جولائی ۱۹۹۴ء
۱۶۷۔	مشرقی شعریات اور لانگ کا تصور	صریر	کراچی	اگست ۱۹۹۴ء
۱۶۸۔	پیش لفظ: حنیف ترین	مجموعہ کلام	دہلی	۱۹۹۵ء

ڈاکٹر نارنگ کی دیدہ وری، باریک بینی، تجرباتی درک، خوش اسلوبی، جرأت فکر اور جرأت اظہار نے ان کے طرزِ تحریر کو ایسی انفرادیت سے ہمکنار کیا ہے کہ ان کی تحریروں کی شناخت بہ آسانی کی جا سکتی ہے۔ یہ منفرد اسلوب ہر شخص کو نصیب بھی نہیں ہو سکتا اور یہ تبھی ممکن ہے جب تحریر میں خونِ جگر کی آمیزش ہو۔ ڈاکٹر نارنگ کے مضامین و مقالات اور دیگر تحریرات میں ان کی لگن و جگر کاوی اس قدر درجۂ اتم پر ہے کہ اس پر ایک سرسری نگاہ سے ہی ان کے خونِ جگر کی آمیزش کی کشید گی کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ نارنگ نے جس نے جس کسی عنوان پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کی تمام تر تفصیلات و جزئیات پر انکی ژرف نگاہی کا ثبوت

ملتا ہے وہ موضوع تحریر پر پوری طرح سے انصاف کر کے حق ادا کرنے کے کوشاں نظر آتے ہیں۔ نارنگ کے مضامین و مقالات کی ایک کثیر تعداد اردو زبان و ادب کی کشادگی کا سبب ہے تاہم جیسے کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام مضامین و مقالات کو یہاں پر پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ساگر کو گاگر میں کیونکہ بند کر دیا جائے۔ تاہم تلخیص سے کام لیکر چند ہی مضامین و مقالات کی نشاندہی یہاں پر یقینی ہے ذیل میں نارنگ کے کچھ انگریزی مقالات کی سرسری فہرست پیش کی جاتی ہے۔

S. NO	TOPIC	BOOK/JOURNAL	YEAR
1-	SOME SOCIAL & CULTURAL ASPECTS OF URDU MASNAVIS.	MEHFIL CHICAGO, VOL. 3, NO 2-3.	1964
2.	TRADITION & INNOVATION FIRAQ GORAKPURI.	NEO ORIENT PRAGUE	1966
3.	ASPIRATION & NASALIZATION IN THE GENERATIVE PHONOLOGY OF HINDI-URDU	LANGUAGE VOL. 47 NO. 3 (U.S.A)	SEP. 1971

4-	GHALIB & THE REBELLION OF 1857.	INDIAN LITERATURE NEW DELHI	JULY AUG. 1972
5-	THE PRINCETON MANUSCRIPT OF KULIYAT-E-SAUDA.	JOURNAL OF AMERICAN ORIENTAL SOCIETY VOL. 93 NO. 94	1973
6.	TRADITION & INOVATION FAIZ AHMAD FAIZ	INDIAN LITERATURE NEW DELHI	1974
7.	GENERATIVE PHONOLOGY & THE RETROFLEX FLAPS OF HINDI-URDU.	BY- BECKER & NARANGS GENERAL LINGUISTICS VOL. 14 NO3	1974
8.	"MAJOR TRENDS IN URDU SHORT STORY"	INDIAN LITERATURE NEW DELHI.	1975
9.	THE SOUND STRUCTURE OF IQBAL'S URDU POETRY, ALSO IN: THE DAILY HINDUSTAN TIMES 6TH NOV. 1977, NEW DELHI	IQBAL COMEMORATIVE VOL. ED. (ALI SARDAR JAFERY & K.S. DUGGAL) NEW DELHI	1977
10.	REVERSE DECTIONARY OF URDU" (FOREWORD) BY DONALD & BECKER, WISCONTRSM UNIVERSITY.	MOHAR PUBLICATIONS NEW DELHI.	1981

11.	"MODERN POETRY: THE INDIAN PONORAMA."	INDIAN POETRY TODAY VOL 4, INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS NEW DELHI.	1981
12.	"HINDI & URDU"	SPARKOG SPARK UNDES VISNING UTGITL AV LANDSTAGET, SPARK MODERN (L.M.S) NORWAY - 1	1982
13.	FREEDOM STRUGGLE & URDU POETRY" CONTRIBUTION OF WRITERS TO INDIAN FREEDOM MOVEMENT.	INDIAN WRITERS UNION KERALA	1985
14	DEVELOPEMENT & USE OF WRITING SYSTEM ACCROSS CULTURE; THE CASE OF ARBO PERSIAN URDU ORTHO GRAPHICAL MODEL"	JOURNAL OF SOUTH ASIAN & MIDDLE EAST STUDIES, VILLANOVA PA VOL. X NO. 2	1986
15-	THE INDIAN FREEDOM STRUGGLE & URDU POETRY."	INDIAN LITERATURE NEW DELHI	JULY AUG. 1986

16-	THREE LANGUAGE FORMULA & URDU	SEMINAR NEWDELHI NO: 332 APRIL 1987.	
17.	RAJINDER SINGH BEDI'S ART & STYLE, METAPHORICAL & MYTHICAL ROOTS"	URDU CANADA, OTTAWA, VOL. 2 NO 1.	1988
18.	FOREWORD TO : THE BEST OF MENTO, ED & TRANSLATED BY JAI RATAN	STERLING PUBLISHERS PVT. LTD. 1989, NEW DELHI	1989
19.	"THE IMPACT OF ISLAMIC MYSTICISM ON URDU POETRY".	INDIAN LITERATURE NEW DELHI	MAR. APR. 1989
20.	POEMS "DEATH" "THE YELLOW DOG", "DOWN THE CATTING MOUNTAIN "SCATTERING" & "MISERABLE" TRANSLATED BY NARANG IN SLECTED POEMS OF WAZIR AGHA. BY JAMIL AZAR AND MUSHTAQ QAMAR	MAKTABA URDU ZABAN, SARGODAHA, PAKISTAN.	

21-	FOREWORD TO: "THE BEST OF MENTO."	FACET BOOKS INTERNATIONAL NEW YORK U.S.A.	1990
22.	"KRISHAN CHANDER: AN IMPRESSION"	KRISHAN CHANDER! SLECTED SHORT STORIES NEW DELHI	1990
23.	DEVELOPEMENT OF URDU POETRY BY SARASWATI SARAN KAIF.	DISCOVERY PUBLISHING HOUSE NEW DELHI	1990
24.	FOREWORD TO: PICK OF MIR; SELECTED & TRANSLATED BY RAJINDER SINGH VERMA.	ENTRY PUBLISHERS LTD. NEW DELHI	1991
25.	THE NEW URDU SHORT STORY: THE SYMBOLIC & ALLEGORICAL DEVICES AND THE STORINESS.	URDU CANADA OTTAWA	1992
26.	COMPROMISE (AKHTER-UL-IMAN), "STILL LIFE" (SHAHARYAR) POEMS TRANSLATED BY DR. NARANG.	OXFORD ANTHOLOGY OF MODERN INDIAN POETRY, EDITED BY DHARWADKER & ROMAN YAN OXFORD UNIVERSITY PRESS.	1994
27.	A QUESTION OF BALANCE	INDIAN LITERATURE NO. 160 (LITERACY THEORY SPECIAL ISSUE)	1994

گوپی چند نارنگ کے یہ مضامین اردو ادب کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ ہر چند کہ یہ مضامین و مقالات انگریزی میں تحریر کیے گئے ہیں تاہم ان میں بھی اردو زبان و ادب کے مسائل ہی در آئے ہیں۔ انگریزی مضامین کے علاوہ نارنگ نے ہندی میں بھی اردو کی مشاطگی کا ہی کاروبار سنبھالا ہے۔ ذیل کے ہندی مقالات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں۔

S No.	नाम	जगह	वर्ष
1.	उर्दू का अदब	हिंदी साहित्य का बृहत इतिहास, नागरी प्रचारिणी सभा, काशी वाराणसी	1978
2.	भूमिका, "मीर तकी मीर" महाकवि मीर तकी मीर	श्री नारायणी प्रकाशन, गाजियाबाद,	1980
3.	"कहाँ का दर्द बैरे सुख है रे फिराक की शायरी।	साप्ताहिक हिन्दुस्तान दिल्ली,	28 मार्च 1982
4.	सागर जो तर गया है तो उदास है"	दिनमान दिल्ली,	" मार्च 1984

5-	अफसाना निगार प्रेमचन्द" प्रेमचन्द : भारतीय साहित्य सदर्भ डा० विनीता जैन	वाणी प्रकाशन, दिल्ली.	1989
6.	नया उर्दू अफसाना समकालीन भारतीय साहित्य,	साहित्य अकादमी नई दिल्ली	1990
7.	संस्कृत भाषा दर्शन और संरचनावादी- उत्तर संरचनावादी चिन्तन"	समकालीन भारतीय साहित्य जुलाई-सितंबर अकादमी नई दिल्ली!	1994

ڈاکٹر نارنگ کے مضامین و مقالات کی یہ ایک مختصر تفصیل ہے۔ جسے اوپر پیش کیا گیا۔ حالیہ دنوں میں ان میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا ہے اور بعض تحریریں ایسی بھی ہیں۔ نارنگ کا کام قدرے پھیلا ہوا ہے۔ اسمیں زبان گرائمر، لفظیات، صرف و نحو، معنیات، صوتیات، رسم الخط، املا، محاورے کہاوتیں، بولیاں، سماجی، تاریخی، تقابلی مطالعات غرضیکہ ادب کا کوئی

ایسا پہلو نہیں جسے انہوں نے صفحۂ قرطاس پر نہ ابھارا ہو ان کے تمام مضامین و مقالات کا احاطہ کرنا ایک پیچیدہ عمل ہے کیونکہ جو شخص تقریباً پچھلی نصف صدی سے آئے دن کسی نہ کسی سیمینار، ادبی تقریب یا کانفرنس میں شمولیت کرتا ہو، ٹیلی ویژن پروگراموں کو پیش کرتا ہو۔ جس کی آئے دن کوئی نہ کوئی تقریر یا بحث و مباحث اردو مجلس اور اردو سروس نشر کرتا ہو۔ ایسے ہمہ پہلوؤں اور ہمہ جہت ادیب کے تمام محسوسات و اظہارات کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ بعید از امکان بھی ہے۔ چنانچہ نارنگ علم فہمی اور ادب شناسی کے اس مرتبۂ عظیم پر پہنچ چکے ہیں جہاں پہنچنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں۔ وہ اپنے قلم سے جس موضوع کو چھوتے ہیں اس کے معنی خیز نتائج برآمد کرتے ہیں نہ صرف تنقید بلکہ کلاسیکی ادب اور جدیدیت غرض ادب کی ہر سمت ان کے مضامین میں متعین ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ان صفات کے تئیں پروفیسر نورالحسن نقوی رقمطراز ہیں:-

"..... ان کے مضامین سے اردو تنقید میں بیش قیمت اضافہ ہوا ہے ان کی تحریروں نے ہماری تنقید کو نئی

جہتوں سے روشناس کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے
کلاسیکی سرمایے کے ساتھ ساتھ جدید ادب کا بھی گہری
نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ گویا اردو ادب کا پورا ذخیرہ
ان کے پیش نظر رہا ہے"۔ ع۱

نارنگ کی ادبی شخصیت کا احاطہ بخوبی گزشتہ اوراق پر پیش کئے گئے ہندی اور انگریزی مقالات و مضامین سے ہوتا ہے۔ نارنگ اردو میں ایک لاثانی ولا فانی رتبہ تو رکھتے ہیں ہی تاہم ہندی اور انگریزی میں بھی انہوں نے میدان مار لیا ہے۔ ہندی خانوادے سے تعلق اور سرزمین ہندوستان میں مکین ہونا ان کے ہندی دان ہونے کا سبب تو ہے ہی لیکن انگریزی زبان و ادب سے واقفیت انہیں جاذب نظر بنا دیتا ہے۔ عموماً اردو ادیب انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں کوئی نیا پن یا کوئی جدید تصور راہ نہیں پاسکتا۔ لیکن نارنگ صاحب کے یہاں اس قسم کی کوتاہیاں کہیں نظر آتی۔ انہیں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب

ع۱ ارمغانِ نارنگ (مرتبہ) پروفیسر عبدالحق، ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی۔ ص۔۱۰۹

پر بھی خاصی دسترس ہے جس کی وجہ سے انہوں نے نئی نئی تھیوریز اور تنقید کے نئے نئے اصولوں کو اپنے مضامین میں نہایت خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ نارنگ کی اس ادا کو ڈاکٹر عبدالوحید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"پروفیسر نارنگ اردو کے معدودے چند ادیبوں اور ناقدوں میں سے ایک ہیں جن کو انگریزی پر بھی کافی عبور ہے۔ وہ بے محابا اس میں گفتگو کر لیتے ہیں..... ان کی تقریر کا انداز اس قدر اسیر کن جو سنتا ہے محو ہو کر رہ جاتا ہے۔" ۱

ڈاکٹر نارنگ اپنی تحریروں میں الفاظ کی قدر و قیمت کا مکمل شعور رکھتے ہیں اور عام طور پر اردو کے نقاد اس صنعت سے عاری نظر آتے ہیں اور انکی تحریر تکرار لفظی اور طوالت سے صاف وشستہ اسی صفت کی بدولت ہیں۔ نارنگ کا ذہن تجرباتی اور استدلالی ہے وہ تخیلیت اور جذباتیت سے بالاتر ہو کر صرف معروضی اور سائینسی تجربات کو بنیاد بنا کر ادب کو

---

۱ ارمغانِ نارنگ (مرتبہ) پروفیسر عبدالحق۔ ص ۲۱۹

پرکھتے ہیں اور یہ بنیادیں MODERN LINGUISTIC کی ودلیعت کی ہوتی ہیں لیکن بحیثیت ناقد وہ شعور روایت کے علاوہ احساسی اور جمالیاتی قوتوں سے بھی آشنا ہیں اور یہ خوبی ان کے طرز نقد کو محض سائینسی اعداد شماری میں مقید نہیں کرتی بلکہ انہیں کے مزاج فن کے EASTHETIC CHARECTER۔ یعنی جمالیاتی کردار سے بھی ہم آہنگ کرتی ہے وہ اپنی لنسل میں موقع و محل کی مناسبت سے رنگینیٔ طبع کو بھی درکار لاتے ہیں جس کی وجہ سے اس میں شستگی، استدلال، توازن، فصاحت، طرحداری اور دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔

اردو میں نارنگ نے اپنی نگارشات کے ذریعے تنقید کو خاصا وقار معیار بخشا ہے۔ وہ اعلیٰ پایہ ماہر لسانیات ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز نقاد بھی ہیں ان کے تنقیدی مضامین و مقالات برصغیر کے معروف ترین رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔ ان میں سے چند خالص لسانی تجزیوں پر ہی مشتمل ہیں مثلاً :

۱۔ اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت :

یہ مضمون اولاً رسالہ نقوش (لاہور) کے شمارہ ۱۰۸ بابت ستمبر ۱۹۶۷ء

میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ممبئی سے ایک مجموعہ "اردو میں لسانیاتی تحقیق" کے نام سے ترتیب دیا اور ۱۹۷۱ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مختلف حضرات کے مضامین کے ساتھ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس مضمون کو بھی شامل کر لیا گیا۔ پروفیسر نارنگ کا یہ مضمون جدید ترین لسانی نقطۂ نگاہ سے مالامال ہے۔ اس مضمون میں نارنگ صاحب چار اہم باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ آوازوں کا مجموعہ

۲۔ بنیادی طور پر زبان بول چال کے لیے ہے جب کہ تحریر ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ زبان تغیر پذیر ہے اور

۴۔ زبان ایک نظام رکھتی ہے۔

انہوں نے پہلی دو شقوں کے تحت یہ واضح کیا ہے کہ اردو میں مصوتوں کی تعداد کثیر اور ان کی کم ہیں۔ دوسری طرف مصمتوں کی آوازیں کم اور علامتیں بسیار ہیں۔ لوگ ان حشو علامتوں کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کیونکہ انہیں عربی اور فارسی سے عقیدت ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس مضمون میں اپنے اس

خیال کی نہایت لطیف پیرائے میں ترجمانی کی ہے۔ نارنگ صاحب کے مطابق لسانیات کے پاس عقیدت کی آنکھ نہیں ہے اور نہ ہی اس کے پاس جذبے کی دھڑکنیں ہیں۔ یہ سائنس ہے جو عقیدت اور جذبات سے ماورا ہو کر حقیقت پر اعتماد رکھتی ہے۔ لسانیات قدر یعنی (VALUE) سے نہیں" بلکہ واقعہ یعنی (FACTS) سے بحث کرتی ہے۔

اس کے بعد وہ روایتی مروجہ گراموں کی خرابی دکھا کر چامسکی کی (TRANSFORMATION) یعنی تشکیلی گرامر سے بحث کرتے ہیں اور اسکی مبادیات درج کر کے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ تشکیلی گرامر ہی وہ گرامر ہے جو برقیاتی ذہن کے ہمرکاب چل سکتی ہے اور جو مستقبل کی ضروریات کو پورا کرے گی۔

اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہہ: یہ مضمون ۱۳ صفحات پر مشتمل مشمولہ "نذر عابد" ۱۹۷۴ء ہے۔ یہ مضمون نہایت دلچسپ ہے اور اسکی دلچسپی کا حال یہ ہے کہ اس سے تسلی نہیں بلکہ جی چاہتا ہے کہ ایسے دلآویز مضمون پر اور لکھا جائے۔ اس مضمون کا نفس اسکے عنوان "اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہہ" سے بخوبی ظاہر ہے۔ زیر نظر مضمون میں کہاوتوں

کی سماجی توجیہہ۔ کہاوتوں کا جزو تشنہ ہے اور محاوروں کی گرہ بندی TITLE WISE یعنی موضوعاتی طور پر کی گئی ہے۔ اس مضمون کی افادیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ مضمون پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ ان موضوعات یعنی "محاوروں" اور "کہاوتوں" پر الگ الگ تحقیقی سطح پر کام ہونا چاہیئے۔ مضمون میں ڈاکٹر نارنگ محاورے کی تعریف میں یوں لکھتے ہیں :-

"علماء نے محاورے کی تعریف یہ کی ہے کہ محاورہ کم سے کم دو لفظوں کا مرکب ہوتا ہے۔"

برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اس بات پر صحیح زور دیا ہے کہ اکثر محاوروں کی بنیاد استعارے پر نہیں بلکہ تمثیل پر ہوتی ہے ان میں سے کم سے کم ایک لفظ یا زیادہ الفاظ یا پورا محاورہ مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ میری رائے میں محاورہ کبھی مکمل جملہ نہیں ہوتا، جملے کا جزو ہوتا ہے۔ کہاوت کے پیچھے کوئی فرضی یا اصلی واقعہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی محاوروں کی فہرست میں کم سے کم حسب ذیل یقیناً کہاوتیں ہیں :-

مرغ (مرغے) کی ٹانگ (ص ۳۷۵)

اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ (" ")

چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل (ص ۲۷۵)
احمد کی پگڑی محمود کے سر (ص ۲۷۶)
چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات (" ")
درزی کی سوئی کبھی گاڑھے میں کبھی کمخواب میں (۲۷۷)

مضمون سے ضرب الامثال سے متعلق علم دو کتابوں (۱) نجم الامثال از نجم الدین دہلوی ۱۹۷۶ء اور (۲) مخزن الامثال از چرنجی لال دہلوی ۱۹۹۰ کا ہوا۔

احتشام صاحب کی لسانی خدمات:۔

یہ مضمون اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء میں الہ آباد سے "شب خون" میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں جملہ لسانی تحریریں جو تعداد میں کم ہی ہیں اُن کا جائزہ لیا گیا۔ احتشام صاحب کے چہیتے موضوعات اردو اور ہندی کا رشتہ، رسم الخط اور زبان اور سماج تھے ان ہی موضوعات کے حوالے سے احتشام صاحب کے خیالات میں جو تغیر اور ارتقاء ہوا ان ہی کی نشاندہی مذکورہ مضمون میں نارنگ نے کی۔ شروع شروع میں احتشام حسین رسم الخط کو زبان سے بالکل آزاد تصور کرتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے محسوس کیا کہ رسم الخط کا نہ صرف

زبان بلکہ زبان بولنے والوں کی تہذیب سے بھی تعلق رکھتا ہے ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ اگر پنجاب سے بہار تک ہر انسان کو ہندی اور اردو کے دونوں کے رسوم الخط سکھائیں جائیں تو آگے چل کر ان دو زبانوں کا سنگھم ممکن ہے یعنی یہ دونوں زبانیں ایک ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ ان کے اس خیال کو محض خوش فہمی قرار دیتے ہیں۔ اردو اور ہندی کے تعلق سے اس مضمون کے ضمن میں نارنگ صاحب کے خیالات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے وہ ہندی اور اردو کو الگ زبانیں قرار دینا چاہتے ہیں اور اسے حقیقت قرار دیکر لکھتے ہیں کہ :

"ہندی اور اردو ایک زبان تو ہیں لیکن غیر مشروط طور پر
نہیں یعنی اصل اور بنیاد ایک ہے لیکن دونوں کی ادبی
روایتوں کا فروغ اور ارتقاء اس طرح ہوا ہے کہ
اب یہ دو الگ الگ مستقل زبانیں بن چکی ہیں۔" ؏۱

اس مضمون میں نارنگ اردو اور ہندی کو اصل اعتبار سے ایک مان کر بھی مختلف ادبی روایات کو پیش نظر رکھکر دونوں کو الگ اور مستقل زبانیں مانتے ہیں۔ شاید ان کا ضمیر لسانی طور پر دونوں زبانوں کو ایک قرار دیتا ہے

؏۱ شب خون اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء الہ آباد ص ۸

مگر ادبی ارتقاء و ترویج اور روایت کو مدِ نظر رکھکر وہ دونوں کو دو الگ زبانیں قرار دیتے ہیں

اُردو ہماری اُردو

لکھنؤ میں ۱۹۸۱ء میں دوسری کل ہند غیر مسلم کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں گوپی چند نارنگ نے خطبہ صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ وہ خطبہ "اردو ہماری اردو" کے نام سے نارنگ کے مقالات میں شامل ہو گیا۔ اس خطبے میں نارنگ صاحب نے اردو کی تعریف میں لکھا ہے:

> "اردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے اردو محض زبان نہیں، ایک طرز زندگی، ایک اسلوبِ زیست بھی ہے۔"

ہر چند کہ اردو واقعی یہ سب نہیں ہے کیونکہ 'اردو تہذیب' نام کی کوئی امتیازی تہذیب کیونکر قرار دی جا سکتی ہے اور نہ ہی زبان کی بنا پر تہذیب الگ ہو سکتی ہے کیونکہ ایک تہذیب میں یقیناً کتنے ہی لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جو اردو شناس ہو سکتے ہیں پھر بھی زبان کی بنا پر اس تہذیب کو خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ ہاں نارنگ کے تئیں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کے

سچے عاشقِ اردو ہونے کی دلیل ہی ہے جو ان سے ایسے فیصلے صادر کرواتی ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر نارنگ اس مضمون میں اردو اور ہندی کے اشتراک پر زور دیتے ہیں اور دوسری جانب اس کی وضاحت بھی کرتے ہیں کہ اردو رسم الخط عربی رسم الخط نہیں ہے بلکہ اسکی ایک آزادانہ حیثیت ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اردو، ہندی اور انگریزی میں جو مقالے تحریر کئے ان میں زیادہ تر مقالے اردو افسانے اور افسانہ نگاروں کے بارے میں ہیں تاہم انہوں نے بہت سے مقالے قدیم اور جدید شعراء کے بارے میں بھی تحریر کئے ہیں۔ یہ بات لائقِ تحسین ہے کہ نارنگ فن پارے کے تمام وکمال کا سامنا کرتے ہیں اور اپنی ژرف نگاہی، پختہ ذوق، نکتہ رسی اور الفاظ فہمی سے اس کے لسانی نظام میں پیوستہ تہہ بہ تہہ پوشیدہ معنیات کی نقاب کشائی کرتے ہیں اس طرح ان کے ناقدانہ شعور کی دو منفرد خصوصیات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ افسانوں یا افسانہ نگاروں کے بارے تجزیاتی اختصاصی اور استدلالی مطالعات سے مقصد رکھکر عام بیانات سے قطعی طور پر اجتناب کرتے ہیں دوسرا یہ کہ وہ اپنی توجہ کو فنکار کے

بجائے فن پارے پر مرکوز کرتے ہیں اور فن پارے کے اسلوبیاتی اور لسانیاتی خواص کے ترکیبی عمل سے پیدا ہونے والے مختلف العنان تصورات اور اقدار کے باہمی ربط کی تجسس اور تحسین کرتے ہیں۔ جہاں تک "RAJINDER SINGH BEDI'S ART & STYLE – METAPHORICAL & MYTHICAL ROOTS" یعنی "بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں" کا تعلق ہے یہ انگریزی مقالہ نارنگ کی عمیق نظری اور رمز شناسی کی ایک بہترین مثال ہے اس مقالے میں قدر سنجی کے منکشف ہونے کے انداز کی بنا پر اردو افسانے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس مقالے میں نارنگ نے بیدی کے افسانہ "گرہن" کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس میں نارنگ صاحب سماجی یا عصری واقعیت کی نشاندہی کرتے ہیں تاہم ایسا کرنے پر وہ ترقی پسندوں کے فارمولائی تنقید کے طریقے کی حد بندیوں کی گرفت میں نہیں آتے وہ فنکارانہ دماغ اور تفکر کی آزادی اور غیر مشروطیت کو بنیادی طور پر لازمی قرار دیتے ہیں۔ جس کی بدولت انہیں "خارجی حقیقت" کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پروفیسر نارنگ افسانوی ادب کی قدردانی

کے اس طرز سے تنقیدی آگہی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے افسانے کو سماجی معلومات کی ترسیلیت کا ذریعہ قرار دینے کے بجائے اس کی لسانیاتی ہیئت میں نشو و نما پانے والی خیالی واقعیت کی دریافت پر زور دیا ہے اور اسی واقعیت ہی کی وساطت سے سماجی معنویت کے پوشیدہ امکانات کا پتہ لگاتے ہیں تاہم وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ افسانے کی لسانی شکل، استعاراتی اور علامتی ساخت اور اسکی اساطیری ہیئت سے ایک ایسی مربوط تخیئلی سطح کے متلاشی ہیں جو ماورائی بلندیوں کا پتہ دیتی ہے۔ نارنگ مارکسی اور تمدنی نقادوں کی اس تنقیدی طرز کو کہ افسانہ میں عصری یا تاریخی حقیقت کی ترجمانی کی نشاندہی پر زور دیا جائے مسترد کرتے ہیں اور ایک منفرد، نئے، معنی خیز اور مثبت تنقیدی اصول کو روا رکھتے ہیں۔ وہ MODERN ذہن رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ تازہ کار، تعقلی و جمالیاتی اور نتیجہ خیز طریقے کی ساخت و پرداخت پر توجہ کرتے ہیں اس مضمون پر شمس الرحمان فاروقی نارنگ کے تئیں اپنے محسوسات کا اظہار یوں کرتے ہیں:۔

"آپ نے وضعیاتی طریقِ کار تو نہیں استعمال کیا لیکن

ہر باخبر نقاد کی طرح آپ نے وضعیاتی نقادوں کی بصیرت سے فائدہ ضرور اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کے بعض افسانوں میں اساطیری معنویت کا جو مطالعہ آپ نے پیش کیا ہے وہ اردو میں اپنی مثال آپ ہے۔ بیدی کے افسانوں میں معنویت کی تلاش کرنے کے سلسلے میں آپ کا یہ مضمون سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے"۔ [1]

• ۔ گوپی چند نارنگ کے خطبات

پروفیسر گوپی چند نارنگ کو قدرت نے خطابت کے بیش بہا وصف سے بھی نوازا ہے یہ صفت ادیبوں میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کو خدا نے یہ وصف ودیعت کیا ہو تو لازمی طور پر اس کی زبانِ قلم اس جوہر کی ہمسری نہیں کر پاتی اور اگر قلم میں طاقت لامحدود ہو تو منہ کی زبان

۱۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ: شخصیت اور ادبی خدمات / کتاب نما کا خصوصی شمارہ مرتبین پروفیسر شہریار، پروفیسر ابوالکلام قاسمی۔ ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر دہلی ص ۲۵

تقریری صلاحیت سے قاصر ہوتی ہے۔ مگر ڈاکٹر نارنگ کے یہاں زبان اور قلم دونوں یکے بعد دیگرے فراٹے بھرتے ہیں۔ خطبہ لاجواب، مقالہ بے مثال اردو کے حق میں تقریریں آئے دن سننے کو ملتی ہیں مگر نارنگ صاحب کی خطابت میں مقناطیسی کشش ہے۔ وہ خطابت پر قانع نظر نہیں آتے۔ ان کی زبان ہمیشہ نئی نئی تحقیق و تنقید کو موثر انداز میں برتنے کے لیے تیار رہتی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تحریریں جہاں پڑھنے والوں کو دعوتِ فکر و نظر دے جاتی ہیں وہاں ان کی تقریر میں الفاظ کا وہ خزانہ بکھیر دیتی ہیں جس میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ان کی تقریریں صاف و شستہ، دلفریب و شگفتہ، خوش اسلوب اور مکمل طور پر معلوماتی ہوتی ہیں۔ ان کی تقریروں کے ایک بار سننے والے بار بار انہیں سننے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ان کے علم کا یہ حال ہے کہ ان کے پاس لفظوں، جملوں، محاوروں اور کہاوتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ ان کے ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے الفاظوں کا ایک وسیع سمندر ہوتا ہے خواہ وہ انگریزی میں تقریر کریں یا اردو میں دونوں ہی زبانوں میں

یکساں روانی، سلاست اور جادو بیانی ہوتی ہے۔ نارنگ صاحب اردو کے قافلہ سالار ہیں اور سا ہیتی نظر کے حامل ہیں ۔ خطابت کے فن میں اس قدر سب سے آگے ہیں کہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ نارنگ میں بہت سی خصوصیات یکجا دیکھی جاسکتی ہیں سب سے زیادہ ان کا اسلوب نگارش تو اس سے بھی زیادہ ان کا طرز تخاطب ۔ وہ اپنی خوش بیانی، جامعیت، منطقی استدلال اور پیرائے اظہار کے لیے اردو دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ نارنگ صاحب آپ نے نکہت گفتار کی بدولت دنیائے اردو کا بلا مقابلہ ایک بہت بڑا اثاثہ ہے اور اس کی وجہ ان کی وسیع علمی، ادبی تحریکات کے اسرار و رموز سے واقفیت، قدیم اور جدید ادب کی شناسائی اور ادب کے تئیں ژرف نگاہی اور عمیق مطالعہ ہے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تقریر پر انتہائی عمدہ الفاظ میں خلیل احمد کے الفاظ یقیناً درست قرار دیئے جاسکتے ہیں جن میں انہوں نے لکھا ہے :۔

" PROF. GOPI CHAND NARANG MUST BE THE FIRST GOOD SPEA-KER OF URDU IN THE MODERN

SENSE FLUENCY AND TORRENTIAL VOCABULARY ARE NOT HIS WEAPONS; HE IS, RATHER, AN EXPERT OF THE SCIENTIFICALLY STRUCTURED DISCOURSE. HE IS HELPED IN THIS BY HIS EXPERTISE IN URDU LINGUISTICS, HIS VASTE KNOWLEDGE OF ITS LITERARY AND STRUCTURAL HISTORY". ع۱

غرض انٹرویو ہو یا نجی گفتگو ہو، یا تقریر نارنگ صاحب کا بیان سامع کے دل کا دامن اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی زبان میں سادگی کے ساتھ بے پناہ دلاویزی اور دلکشی ہے۔ موضوع چاہے کتنا ہی مشکل اور مسئلہ چاہے کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو وہ اپنے واضح اور روشن انداز بیان سے اسے قابل فہم آسان اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ گہری تنقیدی بصیرت،

ع۱ پروفیسر گوپی چند نارنگ حیات و خدمات (از) ڈاکٹر محمد حامد علی خاں ص ۴۲۰

مطالعے کی وسعت، متعلقہ علوم پر کامل دسترس، ادب کے جدید ترین رجحانات سے مکمل واقفیت اور زبان و بیان پر کامل قدرت یہ وہ صفات ہیں جو نارنگ کی تقریر کو عظمت و وقار بخشتے ہیں۔ تقریرِ نارنگ کی انہی خصوصیات نے مولانا کوثر نیازی کو متاثر کیا اور وہ بے محابا کہہ پڑے۔

"مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں نے کسی ادیب اور شاعر کی اتنی اچھی تقریر نہیں سنی تھی۔ سیاستدانوں، واعظوں عوامی خطیبوں اور پارلیمانی مقرروں کی بات دوسری ہے اپنے اپنے میدان میں انکی جولانیٔ طبع کا انداز جداگانہ ہے، لیکن نارنگ صاحب نے جس شستہ اور شیریں ادبی پیرائے میں بے حد سنبھل کر صحیح اور مناسب انتخابِ الفاظ کے ساتھ اظہارِ خیال کیا، وہ گفتگو اور تقریر کے درمیان ایک صنف تھی اور تاثیر اور ابلاغ کے لحاظ سے بلا مبالغہ منفرد۔"[۱]

۱۔ کتاب نما، خصوصی شمارہ ۔ گوپی چند نارنگ (شخصیت اور ادبی کارنامے) مرتبین، پروفیسر شہریار، پروفیسر ابوالکلام قاسمی ۔ ص ۵۶

نارنگ کی تقریر میں وہ اثر ہے کہ ان کے سامعین ان کی تقریریں سن کر دم بخود رہ جاتے ہیں۔ اردو کے اس معتبر نقاد، صاحب طرز ادیب، مایہ ناز محقق، بلند پایہ ماہر لسانیات کا جادو بیان مقرر ہونا تو فطری بات ہے۔

گوپی چند نارنگ کا اردو زبان وادب کے ساتھ نہ صرف دانشوری اور ادب دانی کا ہی رشتہ ہے بلکہ وہ اردو زبان وادب کے ایک عظیم پایہ خطیب کی حیثیت سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ بحیثیت مقرر وہ صرف ہندوستان میں ہی ہر دلعزیز نہیں بلکہ پاکستان، خلیجی ممالک، سوویت یونین، لنڈن، ٹورنٹو امریکہ وغیرہ میں بھی اپنی اس صلاحیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ نارنگ کی تقاریر الفاظ کی دروبست، گفتار کی روانی اور جملوں کی ساخت میں بے بدل ہیں۔ یہ خصوصیات نارنگ کی تقریر وتحریر کے بیچ کم فرق کی ضامن ہیں۔ وہ جب خطاب کرتے ہیں تو انداز تخاطب سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خطبہ دے رہے ہیں۔ مگر جب اسے ٹیپ ریکارڈر پر صدا بند کر کے زیب قرطاس پر لکھا جاتا ہے تو اردو ادب کا ایک لاثانی مقالہ معرض وجود میں آتا ہے۔ خواہ وہ علم لسانیات پر مبنی ہو یا فکشن کے بارے میں ہو، تنقیدی فکر سے لبریز ہو، میدانِ تحقیق سے وابستہ ہو۔ ایک مخصوص تہذیبی تراش اور شستگی و

روانی کا دیدہ زیب مضمون معلوم ہوتا ہے۔ جناب مجتبیٰ حسین کے بقول :

"..... جب وہ بولتے کھڑے ہوتے ہیں تو لگتا ہے
پوری اردو تہذیب بول رہی ہے لہجہ کی شائستگی اور
حلاوت، اس کا اتار چڑھاؤ، استدلال کی معقولیت،
لفظوں کا انتخاب، خیالات کی فراوانی، بولنے کی روانی،
ان سب کے امتزاج کا نام پروفیسر نارنگ کی تقریر
ہے۔" [1]

پروفیسر نارنگ کی ہمہ پہلو اور ہمہ جہت شخصیت کی اہمیت کا راز نہ صرف ان کے مضامین اور ان کی تصانیف کو ہی محیط ہے بلکہ ان کے خطبات بھی اس ضمن میں کم اہمیت کے حامل نہیں۔ بحیثیت خطیب انہوں نے اردو ادب کو کافی وسعت بخشی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے بیرونی ممالک کے سیمناروں میں شرکت کر کے اردو ادب کے ایک قدآور خادم کا جو ثبوت دیا ہے وہ انہیں تا ابد شہرت دوام فراہم کرے گا۔

---

[1]۔ گوپی چند نارنگ : حیات و خدمات (مرتبہ) ڈاکٹر حامد علی خان
ص ۳۷۱۔ (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی)

"ENCYCLOPEDIA OF INDIAN LITERATURE" میں ان دوروں اور ان میں پیش کئے گئے مقالات کا ذکر کچھ اس طرح ملتا ہے۔

"A WIDELY TRAVELLED PERSON, HE HAS DELIVERED LECTURES AT THE UNIVERSITIES OF LONDON, PRAGUE, CHICAGO, BERKELEY, LOS ANGLES, COLUMBIA, ARIZONA, COLORADA, MINNESOTA, CORNELL, PENNSYLVANIA, MC GILL & TORONTA, A NOTED BROADCASTER & TELECASTER, NARANG IS ACLAIMED FOR HIS CONTRIBUTION TO THE URDU LITERARY STUDIES" [1]

---

1. ENCYCLOPEDIA OF INDIAN LITERATURE VOL. III SAHITYA ACCADEMY NEW DELHI P.NO. 2885

انہوں نے اردو زبان وادب کی جو بے لوث خدمات انجام دی ہیں ان کے پیش نظر ان کی شخصیت اس قدر جاذب نظر، اہم اور پرکشش بن گئی کہ بیرون ملک کی لاتعداد انجمنوں، یونیورسٹیوں اور ادبی حلقوں نے بھی اس سے فیضان حاصل کیا اس ضمن میں کچھ مقالات پر دیئے گئے خطبات کی بہ اعتبار سنین تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران شکاگو یونیورسٹی، کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے، کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک، مشی گن یونیورسٹی، این آر برمیکسگل یونیورسٹی مانٹریال نیز اورینٹل انسٹی ٹیوٹ پراگ چیکوسلواکیہ نے نارنگ صاحب کو مدعو کیا اور انہوں نے وہاں جاکر اردو زبان وادب کے مختلف العنان موضوعات پر خطبے دیئے۔

۱۹۶۷ء میں بین الاقوامی مستشرقین کانگریس میں شرکت کے غرض سے نارنگ بطور نمائندۂ حکومت ہند مشی گن پہنچے اور وہاں پر ایک مقالہ پیش کیا جسے خوب سراہا گیا۔

۱۹۸۱ء میں پروفیسر گوپی چند نارنگ حکومت ناروے اور وہاں کی ادبی انجمنوں کے مالی تعاون سے اوسلو ناروے کی دعوت پر گئے۔ وہاں کا

علمی دورہ کیا اور اردو زبان و ادب پر کئی اہم لیکچر دیئے۔

اگست ۱۸ اور اگست ۸۲ء میں اردو مرکز لندن کے زیر اہتمام اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹیڈیز لندن یونیورسٹی میں دو توسیعی خطبات پیش کئے۔

اپریل ۱۹۸۲ء میں ہندو پاک جوش ملیح آبادی سیمنار کراچی میں انجمن سادات امروہہ پاکستان کی دعوت پر شرکت کی غرض سے کراچی پہنچے تو پاکستان کی بہت سی انجمنوں میں اپنی تقریر کے کرتب دکھائے۔ ان میں ترقی اردو پاکستان، پاکستان رائٹرز گلڈ کراچی، مہران رائٹرز گلڈ کراچی، پاکستان نیشنل سنٹر اسلام آباد، پاکستان فاؤنڈیشن لاہور، دائرہ اسلام آباد وغیرہ میں ادبی انجمنوں اور اداروں کے زیر اہتمام توسیعی خطبات پیش کئے اور زبان وادب کے مختلف موضوعات پر لیکچر دیئے۔

اگست ۱۹۸۲ء میں پروفیسر نارنگ میکسیکو تشریف لے گئے اور وہاں سماجیات کی عالمی کانگریس میں شریک ہو کر سماجیات کی عالمی کانفرنس میں سماجی لسانیات کے سیکشن میں اپنا پر مغز مقالہ پیش کیا۔

ستمبر اور اکتوبر ۱۹۸۲ء میں انجمن اردو کینیڈا کی پہلی انٹرنیشنل اردو کانفرنس

منعقدہ لوڈر نیو یونیورسٹی میں شمولیت کی اور مقالہ پیش کیا نیز مختلف یونیورسٹیوں کی دعوت پر واشنگٹن، کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے، لاس اینجلز، اری زونا یونیورسٹی توسان، ڈن یونیورسٹی بولڈر، منی سوتا یونیورسٹی مینا پلس، شکاگو یونیورسٹی، وسکانسن یونیورسٹی میڈین، کورنیل یونیورسٹی نیویارک، کولمبیا یونیورسٹی نیویارک اور پنسل وینیا یونیورسٹی فلاڈلیفا کا دورہ کر کے نارنگ صاحب نے اردو زبان و ادب پر کافی معلوماتی، تحقیقی اور تجزیاتی نوعیت کے بارہ توسیعی خطبات پیش کئے۔

مئی ۱۹۸۴ء میں گوپی چند نارنگ اہل سکھر کی دعوت پر پاکستان روانہ ہو گئے اور پاک و ہند مشاعرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ علاوہ ازیں ہمایوں جیمخانہ سکھر، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، غالب لائبریری کراچی، پاکستان رائٹرز گلڈ کراچی، پاکستان نیشنل سینٹر لاہور، حلقہ اربابِ ذوق لاہور، دائرہ اسلام آباد اور حلقۂ اربابِ ذوق اسلام آباد میں دھواں دار تقریریں کیں اور توسیعی خطبات پیش کئے۔

۱۹۸۶ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۰ء میں مختلف ادبی انجمنوں کی دعوت پر پاکستان کا سفر کیا اور لاتعداد ادبی جلسوں، سیمناروں اور تقریبوں میں

مقالے پڑھے اور لیکچر دیئے۔

۱۹۸۹ء میں ہی انجمن اردو کی دعوت پر ابو ظہبی اور دوبئی کا سفر کیا جشن جمیل جالبی عالی اور دوسری ادبی تقاریب میں شرکت کر کے اپنی تقاریر سے ان محفلوں کی رونق کو دوبالا کیا۔

نومبر ۱۹۹۱ء میں ادیبوں کی پانچ رکنی وفد کی معیت میں سفر چین پر گئے جہاں پیکنگ، منتی آن، ہانگ چو شنگھائی اور ہانگ کانگ کی ادبی تقریبات میں شرکت کی اور خطبات پیش کئے۔

جنوری ۱۹۹۲ء میں عالمی اردو کانفرنس میں شریک ہونے کی غرض سے مارشس پہنچے اور وہاں اجلاس کا صدارتی خطبہ پیش کیا اور ایک اہم مقالہ پیش کیا۔

۱۹۹۳ء میں گوپی چند نارنگ کو اردو سنٹر لندن نے دعوت دی جہاں انہوں نے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹیڈیز میں نئی ادبی تھیوری اور فیض کی شاعری پر دو توسیعی خطبات پیش کئے۔

۱۹۹۵ء میں گوپی چند نارنگ فیض اکادمی لندن کی دعوت پر شرکت کرنے گئے اور وہاں مابعد جدیدیت پر دو توسیعی خطبے دیئے اسی سال

برکلے کیلی فورنیا، لاس اینجلز، ٹورانٹو کا دورہ کیا اور لیکچر دیئے۔ ۱۹۹۵ء میں ہی امیر خسرو پر قطر میں خطبہ دیا۔

گوپی چند نارنگ ادب اردو کے قافلہ سالار کا رتبہ رکھتے ہیں۔ نارنگ صاحب کی دیگر وسیع خدمات تو الگ ہیں لیکن اگر صرف خطبات کے حوالے سے ہی انکی وسعت علمی، جادو بیانی اور عمیق واقفیت کو پرکھا جائے تو تعجب خیز نتائج کا برآمد ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ خطبات کے فن میں نارنگ صاحب اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے صفات میں شاید یہی وہ صفت ہے۔ جو انہیں ہر دلعزیزی کا وقار عطا کرتی ہے۔ نارنگ کے لہجے کی جادو بیانی کا یہ حال ہے کہ جب وہ بولنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے الفاظ کا جادو سامعین کو مسحور کر لیتا ہے اور در و دیوار بھی ہمہ تن گوش انکی طرف محو ہو جاتے ہیں۔ نارنگ تنقیدی زبان کو برتنے کے ایک منفرد گُر سے واقف ہیں۔ شاعر نہ ہونے کے باوجود بھی ان کی نثر میں ایک انفرادی قرینہ اور ایک پُرکشش انداز نمایاں ہوتا ہے۔ شبنم رومانی کے بقول:

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تقریر میں شاعری کرتے ہیں۔"[۱]

---

[۱]۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ: شخصیت اور ادبی کارنامے (مرتبین) پروفیسر شہریار، پروفیسر ابوالکلام قاسمی ص۔ ۷۰

پروفیسر نارنگ کو اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے الفاظ کا انتخاب نہیں کرنا پڑتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الفاظ قطار اندر قطار ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ زبان کی سحر آفرینی سے لطیف ترین خیالات کو مناسب ترین الفاظ میں ملبوس کرنا اور موضوع کی مناسبت کے اعتبار سے الفاظ، جملوں کی ساخت اور لب و لہجے کا انتخاب نارنگ کے اعلیٰ پایہ مقرر ہونے کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ان کی اسی صاف و شستہ، معنی خیز، پرکشش اور واضح نثر کو بصورت مضامین جب کتابوں، جریدوں، رسالوں اور اخباروں میں محفوظ و مخصوص کر لیا جاتا ہے تو اردو زبان و ادب کا اثاثہ گوہر انمول کی مانند بیش قیمت ہونے لگتا ہے۔ نارنگ صاحب کے خطبات کی اس خصوصیت کا ذکر جناب صلاح الدین پرویز کے یہاں نہایت عمدہ الفاظ میں یوں ملتا ہے۔:

> "ڈاکٹر نارنگ کی تقریریں الفاظ کی دروبست، جملوں کی ساخت روانی گفتار میں بھی کانٹے پر تلی ہوئی معلوم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریر و تحریر میں کم فرق ہوتا ہے جب وہ تقریر کر رہے ہوں تو انداز تخاطب

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خطاب کر رہے ہیں لیکن
اگر اسے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ لیا جائے تو علم لسانیات
اور تنقیدی فکر سے لبریز مخصوص تہذیبی تراش خراش
اور شستگی کا پُرحسن مقالہ معلوم ہوتا ہے۔" ۱؎

غرض پروفیسر نارنگ اردو ادب کے وہ جادو بیان مقرر، نقاد، صاحب طرز ادیب، بلند پایہ ماہر لسانیات، مایہ ناز محقق اور قدآور دانشور ہیں جو اپنی تحریر و تقریر دونوں کو ذریعہ بنا کر ادب کو مدتوں مالا مال کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ نارنگ صاحب کے خطبات جب انکی تحریروں کا روپ دھار لیتے ہیں تو اردو ادب کو عروج و منتہا کی منزلوں پر پہنچا دیتے ہیں ان کی تحریر و تقریر کا جو اثاثہ اردو ادب میں موجود ہے اسے دیکھ کر ہر وہ اردو ادب کا شیدائی جو اسکی زلفیں سنوارنے میں لگا ہے یہی دعا کرے گا کہ :

" الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو"

۱؎ ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ : حیات و خدمات (مرتبہ) ڈاکٹر محمد حامد علی خاں، ص ۳۶۶

بابِ سوم

گوپی چند نارنگ اور لسانی و ادبی تحریکات و نظریات

۱۔ سرسید تحریک

۲۔ ترقی پسند تحریک

۳۔ جدیدیت و مابعد جدیدیت

اردو ہندوستانی زبانوں میں سب سے نو عمر زبان کا درجہ رکھتی ہے اور ایسی زبان کا ترقی پسند ہونا فطرتاً لازمی ہے مگر اس کا رشتہ بڑی کہن سال اور وقیع زبانوں اور قدیم روایات سے بھی ہے۔ اس وجہ سے یہ زبان قدیم لسانی خصوصیات کے ساتھ ساتھ جدید امتیازات بھی رکھتی ہے لہٰذا اردو جیسی زبان اور اس کے ادب پر "سرسید تحریک" "ترقی پسند تحریک" اور "جدیدیت" جیسی عالمگیر تحریکات کے کیا اثرات مرتب ہوئے یہ ایک اہم بحث ہے۔ لہٰذا یہاں سرسید تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے اجمالی جائزے کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ ان تینوں اہم تحریکات کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے افکار و خیالات کیا رہے ہیں۔

● (۲) سر سید تحریک

"غدر" کے بعد اگر اردو نثر کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے صحیح معنوں میں "سر سید تحریک" کا ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نثر کے ارتقاء میں اہم کردار رہا ہے۔ "غدر" کے بعد ہندوستان کا سماجی، ثقافتی اور ادبی ڈھانچہ جو پچھلے سو برسوں سے مائل بہ انحطاط تھا، بکھر گیا اور ادبی و عمرانی نظام میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں ان حالات میں سر سید اور ان کے رفقاء نے اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی اور ادبی و تہذیبی تقاضوں کے عین مطابق اردو نثر کو علم و آگہی کی زبان عطا کر کے سماج اور قوم کی اجتماعی فلاح و بہبود اور ترقی و تنزلی کا غماز بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر کے ارتقا کے حوالے سے جو اہمیت "سر سید تحریک" کو حاصل ہے وہ کسی دوسری تحریک کو حاصل نہیں۔ حالانکہ ۱۸۵۷ء سے اب تک کی ادبی تواریخ میں دو اور تحریکات یا رجحانات یعنی "ترقی پسند تحریک" اور "جدیدیت کا رجحان" بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن ان دونوں تحریکات کو اردو نثر اپنی ترقی یافتہ شکل میں میسر آئی تھی جبکہ سر سید اور ان کے رفقاء کے یہاں معاملہ بالکل الگ تھا۔ اس وقت سماجی اور علمی ڈھانچہ جو کہ ٹوٹ کر بکھر گیا

تھا۔ اس وقت انقلابی تبدیلی لانا ازحد لازمی ہوگیا تھا اور جو عملی قوتیں بیکار ہو چکی تھی انہیں پھر سے زندہ کرنا اور ان میں تحرّک پیدا کرنا بھی ضروری تھا۔

۱۸۵۷ء میں برطانوی سامراج کے ہاتھوں ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کی شکست وریخت جہاں ایک طرف ہندوستان کی اقتصادی و معاشی بدحالی کی کتاب کا اول باب ہے وہیں دوسری طرف ہندوستان میں جدیدیت یعنی "MODERNISATION" کے عمل کا ابتدائی نقطہ بھی۔

ایک طرف انگریزوں کے نئے سیاسی اور اقتصادی نظام نے پلک جھپکتے ہی سارے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کا جاگیردارانہ نظام ابدی نیند سو گیا تو دوسری طرف مشینی اور صنعتی انقلاب نے ہندوستان کے سماجی اور معاشی ڈھانچے اور تہذیبی و تمدنی روایات میں زبردست انقلاب برپا کیا۔ ان جدید سماجی و معاشی حالات نے اہلِ ہند کی سوچ میں جو کشادگی اور نیاپن پیدا کیا اس سے لازماً یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ لوگوں میں اپنے ماضی کی روایات کو جدید اور سائنسی نظر سے دیکھنے، پرکھنے اور اسے اپنے حال کے تقاضے کے

مطابق جدید سانچے میں ڈھالنے کی تحریک کا جذبہ پنپنے لگا۔ عملی اور ادبی سطح پر اگر دیکھا جائے تو یہ جذبہ اولاً شاندار، زندہ اور متحرک طریقے سے فورٹ ولیم کالج کے تحت میر امن دہلوی کی نثری داستان "باغ و بہار" میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسطرح میر امن کے معاصرین اور فورٹ ولیم کالج سے باہر کے نثر نگاروں نے بھی میر امن کے طرز کو آگے لے جا کر اردو نثر کو اس جدید ماڈل میں ڈھال کر اردو نثر کی جدیدیت کو مستحکم کیا۔ بعد ازاں ۱۸۲۰ء میں فورٹ ولیم کالج بند ہو گیا اور اس کے کچھ سال بعد ہندوستانیوں کو انگریزی علوم اور انگریزی تہذیب و زبان سکھانے کی غرض سے ۱۸۲۷ء میں دلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اردو نثر کے ارتقائی منازل میں "دلی کالج" کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ دلی کالج کی بدولت اردو نثر کو ماسٹر رام چندر ڈپٹی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ جیسے معتبر قلم کار میسّر آئے۔ علاوہ ازیں "دلی کالج" نے اردو صحافت کے فروغ و ارتقا میں بھی چار چاند لگائے۔ کالج نے "قران السعدین" (ہفتہ وار) اور "محب ہند" (ماہنامہ) کے علاوہ "فوائد الناظرین" (پندرہ روزہ) وغیرہ جاری کر کے ادبی اور صحافتی اعتبار سے اپنا معاون کردار نبھایا۔ اس زمانے میں کالج سے باہر بھی صحافتی سرگرمیاں

دیکھنے میں ملتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۲۵ء میں پریس کی آزادی کا قانون پاس ہو چکا تھا اور ملک کے متعدد شہروں سے مختلف اخبارات شایع ہو رہے تھے جن میں محمد باقر کا اردو اخبار (دہلی) شایع ہوا یہ دلی سے شایع ہونے والا پہلا اخبار ہے اور اسطرح سید محمد کا "سید الاخبار" (دہلی) یہ دونوں اخبار اس زمانے کی صحافت کا شاہکار ہیں۔ ان کے بعد "تہذیب الاخلاق" "اودھ پنچ" "اردو اخبار" "مخزن" "دلگداز" "زمانہ" "ہندوستانی" "زمیندار" وغیرہ نے اردو صحافت میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔

نہ صرف صحافت بلکہ ترجمہ کے فن میں بھی دلی کالج نے ۱۸۴۲ء میں "VERNACULAR TRANSLATION SOCIETY" کے نام سے موسوم ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت مختلف اور متنوع علوم وفنون سے متعلق متعدد انگریزی اور فارسی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا گیا۔ اس ضمن میں "عجائب روزگار" اور "تذکرۃ الکاملین" وغیرہ جیسی کتابوں کے ساتھ ساتھ اصول علم ہیئت، علم ریاضی، فنِ زراعت، معاشیات اور قانون وغیرہ مضامین جیسے موضوعات پر بیسیوں کتابیں عام فہم اور سلیس اردو نثر میں شایع ہوئیں۔

اردو نثر کے ارتقاء کی تاریخ میں جو عکس سب سے پہلے غالب رہا وہ مرزا اسداللہ خان غالبؔ کی نثر کا عکس ہے۔ انیسویں صدی کے شروعات میں ہندوستان کی سماجی و تہذیبی زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی ترجمانی جس قلم کار کے یہاں زیادہ نمایاں ہے وہ مرزا غالب ہی ہیں۔ خصوصاً غالبؔ کے وہ خطوط جو انہوں نے ۱۸۵۰ء کے آس پاس لکھے ہیں وہ نہ صرف ہمیں غالب کی ذات سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ اس زمانے کی دلی کے گلی کوچوں کی بھی سیر کراتے ہیں۔ اگر غالب کی نثر کے بارے میں یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنی نثر کے ذریعے محمد حسین آزاد، مہدی افادی، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، شبلی، حالی، اور سر سید جیسے نثر نگاروں کے لئے راہ ہموار کی تو مبالغہ نہ ہوگا۔

۱۸۵۷ء کا غدر سر سید نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان ہنگامی حالات نے سر سید کے قلب و ذہن کو بڑی گہرائی سے متاثر کیا تھا۔ سر سید چونکہ قوم کے لیے ایک دردمند دل رکھنے والے مفکر تھے اس لیے انہوں نے اس تباہی میں اپنے مال واسباب میں لٹنے سے زیادہ اپنی قوم کے بکھرنے کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ سر سید ایک دانشمند اور مفکر قومی

رہنما تھے اس لیے غدر کی تباہی کا ماتم کرنے کے لیے وہ کنجِ تنہا میں ماتم کرنے کے بجائے اپنی قوم یعنی ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کمربستہ ہوکر ترقی کی نئی راہوں کی تلاش کے لیے کوشاں ہوگئے۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمان حکمران قوم ہوا کرتی تھی لیکن اپنے غیر مفکرانہ طرزِ عمل کے طفیل، ۱۸۵۷ء اور انگریزوں کی طرف سے ہونے والی سیاسی سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کا نشانہ بھی یہی قوم بنی۔ چنانچہ مسلم قوم اپنی روایت پسندی اور قدامت پسندی کی وجہ سے انگریزوں کو اور انکے جدید طرزِ عمل کو قوم دشمن عناصر سے تعبیر کرنے لگے۔ مسلمان نفسیاتی طور اس خوف کی زد میں آگئے کہ انگریز انہیں عیسائی بنانے کی ترکیبیں سوچ رہے ہیں اسلیے وہ انگریزوں اور ان کے ساتھ لائی ہوئی ہر ترقی یافتہ تبدیلی یہاں تک کہ انگریزی تعلیم سے بھی دور رہنے لگے اور نتیجتاً مسلمان قوم میں سستی اور کاہلی پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے وہ اپنے ہی خول میں قید اپنی تباہی کا ماتم کرنے میں مشغول ہوگئے۔ مسلمان مادی ترقی سے نفرت کرنے لگے اور ان کے نزدیک نئی تہذیب مادیت پرستی روحانیت کے خاتمے کا اعلان سمجھی جانے لگی اور ایسی صورت حال میں ان کے

نزدیک حکمت عملی کے طور پر قدامت میں ہی فلاح کو تلاش کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ حالانکہ ایسی صورت حال میں ایک طرف تو سامراجی طاقتوں سے آزادی اور دوسری طرف اقتصادی اور سیاسی بدحالی کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کروائی، ایسی صورت حال میں ہندوستان کے مذاہب میں قدیم روایات کی بازیافت کے ساتھ ساتھ علیٰحدگی پسندی کے رجحانات کا پروان چڑھنا یقینی ہو گیا۔ اس صورتِ حال کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ یوں رقمطراز ہیں۔

> "مذہب میں قدیم سے محبت اور احیائے ماضی کے یہ جذبات انتہا پسندی اور سخت گیری کو اپنے ساتھ لائے۔ غدر کے بعد مسلمان عام طور پر یہ سمجھنے لگے تھے کہ مادی زوال روحانی زوال کا نتیجہ ہے اور اس سے قدیم مذہب ہی نجات دلا سکتا ہے چنانچہ قدیم قدروں کا سہارا لیکر قدیم اخلاقی اور مذہبی تصورات کو پھر سے زندہ کیا جانے لگا۔ غلامی کی توجیہ چونکہ مذہبی نقطہ نظر سے کی گئی، لہٰذا آگے چل کر جب

آزادی کے لیے عملی جدوجہد شروع ہوئی تو سیاسی اور مذہبی قدروں میں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ مذہبی تحریکیں ایک طرف تو سامراج دشمنی اور حریت پسندی کے جذبے کو تقویت پہنچاتی تھیں لیکن دوسری طرف چونکہ یہ معاشی اور سیاسی بدحالی کا تجزیہ تصوراتی سطح پر کرتی تھیں۔ اس لئے ماضی پرستی اور تجدید مذہب کے رجحانات شدت پکڑنے لگے جس سے آگے چل کر علیحدگی پسندی کو تقویت ملی۔" [۱]

جہاں تک ہندوستان کی دوسری غیر مسلم قوموں کا تعلق ہے۔ یہ سیاسی، سماجی، علمی اور معاشی اعتبار سے کافی پیچھے تھیں۔ انہوں نے موقعہ کی نزاکت کو بہت جلد ذہن نشین کیا اور انگریزوں کے دورِ اقتدار میں آتے ہی ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ انگریزی زبان، تہذیب و تمدن تعلیم اور انتظامیہ غرض انگریزی تہذیب کے ساتھ جو بھی نئی تبدیلی اپنے ساتھ لائی اس کا پُرجوش استقبال کیا اور نتیجتاً یہ قومیں جو کبھی پس ماندہ

---

[۱] ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری (از) گوپی چند نارنگ ص۔ ۲۲۲-۲۲۲

اور بچھڑی ہوئی تھیں، ترقی کی راہوں پر بڑی تیزی کے ساتھ گامزن ہونے لگیں۔ جبکہ مسلمان سیاسی، سماجی، علمی، اقتصادی غرض ہر اعتبار سے زمانے کے ساتھ چلنے سے قاصر رہے جس کی وجہ سے یہ قوم (مسلمان) جو کچھ ہی عرصہ قبل دوسری اقوام کی بہ نسبت ترقی یافتہ، باشعور اور با اختیار تھیں، بدحالی کا شکار ہونے لگی اور اس بات کو سب سے پہلے سرسید احمد خان نے مکمل طور پر ذہن نشین کیا اور مسلمانوں کو نئی تہذیب اور نئی تعلیم کو خیر مقدم کرنے کی طرف راغب ہونے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ اس قوم کا کھویا ہوا وقار اور تحرک اسے واپس مل پائے بقول پروفیسر نارنگ:

> "غدر" کے بعد مسلمان بعض وجوہ سے نئی تاریخی قوتوں کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس کے برعکس ہندو نئی تعلیم کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور کافی آگے بڑھ چکے تھے۔ چنانچہ سرسید نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے نئی تعلیم حاصل کرنے اور انگریزوں سے مفاہمت کرنے کو لازمی قرار دیا، تاکہ وہ ہندوستان کے دوسرے لوگوں سے ذہنی، مادی

اور معاشی طور پر بچھڑے ہوئے نہ رہیں۔" ۱؎

سرسید نے اپنے قوم کی حالت میں سدھار لانے کیلئے کئی سطحوں پر اقدامات کئے اور اس بیچ مسلمان مفکروں اور دانشوروں کا ایک مجمع ان کے گرد جمع ہو گیا۔ ان علماء میں مولانا شبلی، مولانا حالی، مولانا چراغ علی، محسن الملک، مولانا سید احمد، منشی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، کرامت حسین اور زین العابدین وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جا سکتے ہیں۔ ان ہی علم دوست مفکرین کی اجتماعی سعی اور قلمی مشقت نے بعد میں ایک باقاعدہ تحریک کو جنم دیا جو ہندوستان کی تاریخ میں "سرسید تحریک" یا "علی گڈھ تحریک" کے نام سے مشہور ہے۔ سرسید تحریک نہ صرف خالصتاً ایک علمی و ادبی تحریک تھی بلکہ اس تحریک کے پس پردہ مسلمانوں کو ان کے کھوئے ہوئے مقام کی تلاش کی کوشش بھی تھی اور انہیں جدید تعلیم سے روشناس کرانے کا مقصد بھی تاکہ وہ ہندوستان کی دوسری قوموں کی ہمسری بھی کر سکیں اور حکمران افرنگیوں کو اپنی طاقت اور استدلال کا احساس بھی دلا سکیں۔ مگر ایسا کرنا آسان نہ تھا۔ مسلمان جو انگریزوں اور ان کے ساتھ آنے والی تہذیب و تمدن

۱؎ ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔ از۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۲۲۴

اور تعلیم و ترقی کا نام سنتے ہی کوسوں دور بھاگتے تھے ان میں انگریزی تعلیم کو ترقی کا راستہ بنا کر کسی بھی قسم کی بیداری لانا اتنا آسان نہ تھا۔ ایک تو یہ بات بذاتِ خود دشوار ترین تھی، دوسرے سرسید کو اپنی تحریک کو آگے لے جانے میں بھی سخت ترین دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور یہ دشواریاں نہ صرف سرسید کی ذات کے لیے بلکہ اس تحریک کے لئے بھی کھڑی ہوگئیں بعض لوگوں کے دل میں جو انگریزی حکومت کے تحت کام کر رہے تھے، سرسید کے خلاف یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ وہ مسلمانوں میں مذہبی بیداری کا شعور پیدا کر کے انہیں انگریزوں کے خلاف بھڑکا رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کو ہندوستان میں الگ تھلگ کر کے دوسری قوموں کے مدِمقابل کر رہے ہیں۔ کہیں دوسری قوموں نے انگریزوں میں اس تاثر کو مستحکم کرنے کے ہر ممکن اقدامات کئے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ذمہ فقط مسلمانوں کا ہے اور یوں انگریز مسلمانوں کو دشمن سمجھ کر ان کے معاملے میں اپنا معاندانہ رویہ اختیار کرتے تھے۔ علاوہ ازیں خود مسلمانوں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ انگریزوں کی تعلیم، جدید علوم و فنون کو "کفر" تصور کرتے تھے اور سرسید اور ان کے رفقاء کو اس ضمن میں اپنی تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ ان حالات نے سرسید

کو کافی پریشانی میں مبتلا کیا مگر سرسید نے اپنے رفقائے کار سمیت ان تمام چیلنجوں اور سنگینیوں کا کمر بستہ ہو کر مقابلہ کیا۔ سرسید کا مشن عظیم تھا۔ ان پر کیے گئے اعتراضات میں بعض اوقات ان کی حب الوطنی کی طرف بھی انگشت نمائی کی گئی مگر ان کی کوششیں خلوص اور نیکی پر مبنی تھیں وہ مسلمانوں کو جدید علوم و فنون اور انگریزی تعلیم سے روشناس کر کے ان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادیاتی حالات کو بہتر بنانے کا تہیہ کر چکے تھے اور انہوں نے "تفسیر احمد" اور اس قسم کے دیگر مضامین لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ انگریزی زبان و معاشرت اختیار کرنے میں کوئی عیب نہیں اور نہ ہی یہ مذہب کے منافی ہے، نہ جدید علوم یعنی سائنس، فلسفہ وغیرہ سے کسی شخص کے کافر بننے میں کوئی سچائی ہے۔ یہ مشن سرسید کا ایک ایسا مشن ہے جس میں کسی مخصوص قوم کی بھلائی ضرور ہے لیکن اس سے دوسری قومیں بھی استفادہ ہی کر سکتی ہیں نہ کہ کسی خرابی کا کوئی احتمال ہے۔ اس بات کی شہادت پروفیسر نارنگ کے یہاں بھی ان الفاظ میں ملتی ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ سرسید کی کوششیں نیک نیتی

اور خلوص پر مبنی تھیں ان کے دردِ دل اور حب الوطنی
پر شبہ کرنا تاریخی دیانت داری کو ہاتھ سے دینا ہے
اِن کے پیشِ نظر وسیع اور بلند تر مقاصد تھے۔ وہ مشرق
اور مغرب کا ملاپ کرانا چاہتے تھے۔" ؎۱

سرسید نے اپنے قلم کے ذریعے انگریزوں کی ان تمام غلط فہمیوں کو رفتہ رفتہ دور کیا جن کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان جبر و استحصال کی چکی میں پسے جاتے تھے۔ انگریز مسلمانوں کو طرح طرح سے اپنی ظلم کا نشانہ بناتے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو ذہنی کوفت کرنے کے لیے اور ان کے عقائد کو مجروح کرنے کے لیے انگریز مبلغین اور مصنفین نے کچھ ایسی کتابیں لکھیں جن سے بالعموم مسلمان قوم اور بالخصوص سرسید کی ذات مضطرب ہوگئی مثال کے طور پر "ہنٹر" کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" اور سر ولیم میور کی کتاب "دی لائف آف محمدؐ" وغیرہ میں مسلمانوں کے خلاف اور سیرت پاکؐ کے خلاف زہر افشانی کی۔ سرسید نے اس کا جواب لکھنے کے لیے اپنا تمام اثاثہ فروخت کیا اور انگلستان گئے اور اس کا دندان شکن، مفصل اور مدلل جواب

؎۱ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) ص ۳۲۵

"خطبات احمدیہ" کے نام سے شایع کیا۔ اس کے شایع ہوتے ہی انگریزوں کے اعتراضات بھی ختم ہو گئے یوں "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ دی اور مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی یہ غلط فہمیاں بھی ختم کر دیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔

ان قلمی خدمات میں کامیابی کے سبب سرسید نے زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ اپنی قومی اور علمی خدمات کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی ۱۸۵۹ء میں سرسید نے مرادآباد میں ایک فارسی اسکول قائم کیا اور چند ہی برس بعد ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائیٹی قائم کی جو ۱۸۶۴ء میں علی گڈھ منتقل ہوئی جس کے تحت جدید علم وفن سے متعلق تقریباً چالیس کتابوں کے آسان عام فہم، صاف اور سلیس اردو میں ترجمے کروائے گئے۔ ان میں تاریخ، فلسفہ، ریاضی، علم برقیات، طبیعات اور علم آلات وغیرہ جیسے موضوعات در آئے ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" کا اجراء بھی مسلمانوں کو جدیدیت کے رجحان کو مدِنظر رکھ کر ہی کیا۔ اس میں شائع ہونے والے سرسید اور ان کے رفقائے کار کے مختلف اور متنوع مضامین نے مسلمانوں کو ماضی پرستی اور قدامت پرستی کی تاریک

دنیا سے نکال کر جدید اور پُرنور دنیا میں لایا جہاں وہ اپنے مستقبل کی تابناکی کے سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔

سرسید تحریک نے اپنے عظیم مقصد کو پورا کرنے کے لیے ادبی سطح پر جو اقدامات کئے ان میں سب سے پہلا قدم اردو نثر سے متعلق تھا۔ سرسید نے اپنے تمام رفقائے کار سمیت اردو نثر کے لیے مشاطگی کا کام انجام دیا۔ انہوں نے نہ صرف جدید علم وفن اور فکر و فلسفہ کو اردو کے قالب میں بڑے سلیقے کے ساتھ ڈھالا بلکہ اردو نثر کو بدلتے ہوئے سماجی و سیاسی رجحانات اور تقاضوں کے مطابق نیا راستہ بھی دکھا دیا اور اسے پہلی بار کسی بادشاہ، حکمران، صاحب زر، یا افسر کے محل سے نکال کر عام انسان کے مسائل و مصائب، خواہشات و خطرات کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا اور یوں اس میں اپنے عہد کے ایک فرد اور فرد کے توسط سے سماج اور سماج کے انسانوں کے حالات و واقعات اور خارجی و داخلی احساسات غرض ہر کیفیت کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ پروفیسر نورالحسن نقوی سرسید کی نثر کی ان خوبیوں کو ان الفاظ میں بجا طور پر سراہتے ہیں:

"..... نثر نگار سرسید خود تھے اس لیے نثر کی دنیا میں

انہوں نے خود اپنی تحریروں سے انقلاب پیدا کردیا
انہوں نے مدعا نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اپنی بات کو دلیلوں
کے ساتھ پیش کرنے کا راستہ دکھایا۔ گویا استدلالی
نثر کی مثال قائم کی۔ نثر میں وضاحت، صراحت اور
قطعیت کی اہمیت واضح کی۔ اردو نثر کو تصنع، فضول
عبارت آرائی، لفاظی اور مبالغہ آرائی سے نجات دلائی۔
انہوں نے خود بہت کچھ لکھا اور لکھنے والوں کی ایک
بڑی جماعت تیار کردی۔ اردو نثر ان کے احسان سے
گرانبار رہے۔" ؏۱

غرض اردو نثر آج جس مقام پر پہنچی ہے وہ سرسید اور سرسید تحریک سے وابستہ مصنفین اور ادباء کے سبب ہی ہے۔ اردو میں سائینس، فلسفہ، مذہبیات و اخلاقیات کے علاوہ مختلف علوم و فنون سے متعلق وافر مقدار میں مواد اسی زمانے میں جمع ہوا۔ ادبی سطح پر تنقید نگاری، ناول نگاری، سوانح نگاری، تاریخ نگاری اور مقالہ نگاری وغیرہ کا باقاعدہ آغاز و ارتقاء

؏۱ تاریخِ ادب اردو۔ از۔ نورالحسن نقوی ص ۲۹۰

بھی زیادہ تر سرسید اور ان کے رفقاء کے ہی ہاتھوں ہوا۔ تنقید نگاری کی ابتداء اور ارتقاء میں سرسید تحریک سے وابستہ دو اہم ناموں کے کارنامے قابل رشک اور قابل غور ہیں، یہ نام ہیں مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴) اور علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴) کے۔

حالی کی نثر نگاری کا آغاز ۱۸۶۷ء میں ایک مذہبی نوعیت کی کتاب "تریاق مسموم" سے ہوا۔ حالانکہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز حالی اس سے پہلے ہی شاعری سے کر چکے تھے لاہور میں حالی نے اپنے قیام کے دوران محمد حسین آزاد کے جدید موضوعاتی مشاعروں کے لیے چار مثنویاں "برسات"، "امید"، "انصاف" اور "حب وطن" لکھیں تاہم لاہور سے دلی آتے ہی سرسید تحریک سے وابستہ ہو گئے تو سرسید کے کہنے پر انہوں نے "مسدس مدوجزر اسلام" اور اسی طرز کی دوسری نظمیں لکھیں۔ مگر عروج کی منزلوں تک بحیثیت نثر نگار کے ہی پہنچے۔ حالانکہ اردو شاعری میں بھی اس وقت کوئی ایسا شاعر نہ تھا جو حالی کی ہمسری کر سکے حالی کا سب سے بڑا شعری کارنامہ "مسدس" ہے جسے لکھ کر حالی نے اردو شاعری میں بھی اپنی چھاپ چھوڑ دی ہے مسدس حالی ایک روشن نقش ہے کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اسکی

قوت اور زرخیزی کی چمک میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جسے اردو نظم کی دنیا میں اولیت حاصل ہے۔ مذہبی ہونے کے باوجود اس میں ایک خالص ہندوستانی فضا کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی اسمیں اس زمانے کے بدلتے ہوئے حالات قطار در قطار دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس نظم کی عظمت کا اعتراف سردار جعفری کے حوالے سے پروفیسر نارنگ یوں کرتے ہیں۔

"مسدس حالی کا شاہکار ہے۔ اسے بلا شبہ اردو کی پہلی عظیم نظم کہہ سکتے ہیں۔ یہ صرف مسلمانوں کے لیے لکھی گئی اور بے شک ایک مذہبی نظم ہے۔ لیکن اس میں ہندوستان کی فضا ہے۔ سردار جعفری نے غلط نہیں کہا کہ "حالی چونکہ اسلامی تہذیب و تمدن کے انحطاط اور مسلمان شریف خاندانوں کی پستی کا بیان انتہائی خلوص اور شاعرانہ دردمندی سے کر رہے تھے۔ مسدس ہندوستان کے جاگیرداری عہد کے زوال کی بڑی مکمل تصویر بن گئی ہے"۔ اس لحاظ سے یہ ہماری قومی شاعری کا

کا سنگ بنیاد ہے جس کے ذریعہ حالیؔ نے پورے
جوش اور ولولے کے ساتھ قوم کو حرکت اور بیداری
کا پیام دیا اور یہی اس کی اہمیت کا راز ہے۔" [۱]

یوں تو شاعری میں بھی حالی نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا تاہم یہاں علی گڑھ تحریک کے حوالے سے ہمارا سروکار نثر ہے۔ اسلئے موقع کی مناسبت کو ذہن نشین کرتے ہوئے قلم نثرِ حالی کے ہی احوال کے بیان کا تقاضا کرتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں "تریاق مسموم" کے ساتھ ہی ایک قصہ "مجالس النساء" کے نام سے حالیؔ نے لکھا۔ مگر "حیات سعدی" "حیات جاوید" "یادگار غالب" اور "مقدمہ شعر و شاعری" مع دیوان اور ان کے علاوہ بیشتر عنوانات پر تقریباً چالیس مضامین میں حالی کی نثر اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ چونکہ ہر بڑے فنکار کو اپنے فن کی پہچان سب سے پہلے خود ہوتی ہے۔ جس طرح میرؔ کو اپنی طبیعت میں دریا کی روانی سب سے پہلے خود کو ہی نظر آئی اور غالبؔ کو بادہ خواری نے اپنے آپ کو مسائلِ تصوف کا بیان کرنے پر "ولی" سمجھنے سے روکا ورنہ ان کا بیان منفرد اور اولیاؤں

---

[۱] ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔ از۔ گوپی چند نارنگ ص ۳۲۷-۳۲۸

جیسا تھا اس بات کا اعتراف انہوں نے خود کیا۔ اسی طرح "مجموعۂ نظم حالؔی" کے مقدمہ میں حالی بھی اردو نثر نگاری میں اپنی قائم کردہ بنیاد اور اپنے فن کا اعتراف ان حقیر الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں :

" میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے اور اس پر عمارت چنی ہے اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آیندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔" ؏۱

حالؔی زبان کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے وہ اس بات سے بھی پوری طرح واقف تھے کہ تخلیقی زبان کو جاندار اور متحرک ہونا چاہیے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ زیادہ معنی رکھتا ہے کہ تخلیقی زبان کو اپنے عہد اور اپنے سماج کی صحیح ترجمانی کے لیے تکلف اور تصنع کے بجائے سادہ اور سلیس ہونا چاہیے۔ حالؔی کے نقطۂ نظر میں خیال کیسا ہی ارفع ترین اور دقیق کیوں نہ ہو مگر اسے ادا کرتے وقت یہ شرط لازمی ہے کہ یہ پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور جہاں تک

؏۱ مجموعۂ نظم حالی۔ مقدمہ۔ ص ۴

الفاظ کا تعلق ہے یہ بھی روزمرہ کی بات چیت اور محاورات کے قریب ہوں۔ حالی نے اپنی نثر اور اپنے بیان میں شگفتگی جیسی خوبیوں کی طرف اگرچہ توجہ نہ کی لیکن اردو نثر نے حالی کے یہاں جو اسلوب لیا اور جن خوبیوں کو حالی سے مستعار لیا ان کا رواج آگے چل کر اردو نثر کی سب سے بڑی خوبی بن گیا۔ بقول نورالحسن نقوی :

"مولانا حالی کی نثر سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ توانا اور پرتاثیر ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے یہاں نہ مولوی نذیر احمد کا زورِ بیان ہے نہ علامہ شبلی کی سی شگفتگی و رعنائی۔ اس کے باوجود اس میں ایک خاص طرح کی دلکشی ہے جو اپنی بات کو واضح انداز میں پیش کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آگے چل کر اردو میں جس نثر نے رواج پایا اس کی بنیاد حالی کی نثر پر ہے۔"[1]

حالی کی نثر اردو میں سادہ اور کامیاب نثر کا نمونہ ہے۔ انہوں نے گنجلک فارسی و عربی الفاظ اور محاورات و تراکیب سے عموماً پرہیز کیا اور عام فہم

---

[1] تاریخ ادب اردو۔ از۔ نورالحسن نقوی۔ ص ۲۹۵۔

ہندی الفاظ، کھڑی بولی کے الفاظ و تراکیب کا استعمال نہایت ہُنر مندی کے ساتھ کیا، نہ صرف یہ بلکہ اپنے عصری مزاج کے پیشِ نظر حالؔی کے یہاں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کثرت کے ساتھ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حالی کی نثر سادگی کے علاوہ ایک منفرد جمالیات بھی رکھتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ حالی اردو کی لسانی ترکیب اور مزاج سے بھی واقف تھے۔ حالی کی نثر سادگی اور سلاست کے باوجود منفرد اور پُر تاثیر ہے اگرچہ حالؔی کے یہاں آرائش و زیبائش اور ضائع و بدائع کا استعمال بہت کم ملتا ہے مگر پھر بھی انکی تحریریں نرمی، روانی اور دلگدازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ ان کی نثر کی ان ہی لافانی خوبیوں کو مدِنظر رکھ کر اردو تنقید کے استاد کلیم الدین احمد نے ان الفاظ میں حالی کی نثر کو خراجِ تحسین عطا کیا۔

"...... ادبی نقطۂ نظر سے اگر کوئی چیز دائمی ہے تو وہ شاعری نہیں، تنقید بھی نہیں، حالی کی نثر ہے۔"[۱]

سرسید تحریک سے وابستہ نثر نگاروں میں سرسید احمد خان اور

---

[۱] زبان گویا۔ مقالاتِ حالی۔ ص ۲۰۵

خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی طرح ایک اور نمائندہ نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ شبلی کی علمی و ادبی شخصیت کا تعلق جہاں تک ہے، انہوں نے بے شک کم عمر پائی لیکن اس کے باوجود سرسید اور حالیؔ کی علمی و ادبی خدمات پر فوقیت حاصل کی اور اس کی وجہ شبلی کی طبیعت کا تنوع ہے۔ وہ کسی بندھے ٹکے لائحہ عمل پر نہ رہے بلکہ انہوں نے مختلف اور متنوع موضوعات کو آڑھے لیا۔ تاریخ نگاری، فلسفہ، علم الکلام اور تقابلی تنقید جیسے موضوعات کی اردو نثر میں داغ بیل ڈالنے کا سہرا شبلی کے سر ہی ہے۔ اس کے علاوہ سوانح نگاری، مقالہ نگاری، تنقید نگاری اور سفر نامہ جیسے ادبی جولانگاہوں میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے اور اس بات کی تصدیق ان کی تصانیف الفاروق، المامون، علم الکلام، الغزالی، الکلام، سوانح مولانا روم، سیرت النعمان موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ، شعر العجم، سفر نامہ مصر و روم و شام اور متفرق علمی و ادبی مضامین سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سرسید اور حالیؔ کے نسبت شبلی کی نثر ایک منفرد تخلیقی شان کی حامل ہے۔ شبلی کی نثر شبلی کی ذات اور حیات کی عکاسی تو کرتی ہی ہے لیکن اس کی خاص زبان اور اس کے اسلوب کی وساطت سے یہ نثر انکے زمانے کے سماجی و عمرانی، سیاسی و تہذیبی

اور علمی و ادبی نشیب و فراز کا ایک مکمل خاکہ بھی مرتب کرتی ہے۔

شبلی نعمانی اردو ادب کی ایک ایسی عظیم المرتبت، شخصیت کا نام ہے جنکی زندگی علم و ادب میں ایک مسلسل جدو جہد کی ترجمان ہے۔ شبلی وقتِ آخر تک بڑی محنت لگن اور مذہبی جوش و عقیدت کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی ذات ایک انجمن سے کم نہ تھی وہ خود اپنی ذات میں ہمہ پہلو علمی و ادبی شعور رکھتے تھے اسی بنا پر ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے انہیں ایک دبستان سے تعبیر کیا ہے لکھتے ہیں۔

"وہ (شبلی) ایک فرد نہیں بلکہ ایک دبستان ہیں" ع[۱]

شبلی کا انداز تحریر منفرد ہے۔ ان کے اسلوب میں صفائی، شگفتگی، برجستگی اور معنی آفرینی ملتی ہے۔ شبلی کی نثر کا اپنا ایک رنگ ہے۔ ان کی نثر میں ان کے قلم کی رنگینی اور بیان کی چاشنی جگہ جگہ پڑھنے والے کو مسحّر کرتی ہے۔ تاریخ کی سپاٹ حقیقتیں، فلسفہ و علم الکلام کے خشک مضامین، سیرت نگاری کا سادہ بیان تبصرہ و تنقید کی ٹھوس واقعیت، اصول و مبادیات کا رنگ ان کی نثر میں صاف جھلکتا ہے جس سے ان کی حیثیت ادب میں

ع۱ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی (مرتبہ) شبلی ایک دبستان، ص ۱۲

پختہ ہو جاتی ہے۔ ان اوصاف نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر شبلی کی حیات کا پھول گلستان اردو سے بعید ہی کھلا تھا تاہم اس کی خوشبو نے تمام عالم ادب کو معطر کیا اور بقولِ ڈاکٹر اعجاز حسین :

"غالباً یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ شبلی پہلے شخص ہیں
جو کہ لکھنؤ یا دہلی کے رہنے والے نہ تھے مگر پھر بھی
زمانے نے آپ کی تحریر کو مستند سمجھا۔" ع[۱]

در حقیقت اردو زبان کو ادبی زبان بنانے میں سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کی کوششیں کارفرما ہیں۔ اگرچہ ان بزرگوں کے کارنامے اپنی اپنی جگہوں پر مبسوط ہیں لیکن ان میں مولانا شبلی کی تصانیف تنوع اور کثرت کے اعتبار سے سب سے زیادہ مستند اور منفرد ہیں۔ شبلی ادب اردو کے بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد حیثیت کے نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نگاہ کہاں کہاں دوڑتی ہے۔ ادبیات، سیاسیات، تعلیم تاریخ غرض ہر جگہ شبلی کی موجودگی نظر آتی ہے۔ تاریخ میں فلسفہ کا رنگ پیش کرنے میں انہیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی ادبی تحریروں میں معتبر

ع[۱] ڈاکٹر اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو ص ۲۸۰

اسلوب کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی نثر میں بے تکلفی اور سادگی کی فراوانی ملتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شگفتہ اور دلنشین اندازانکی تحریر کا مایہ امتیاز ہے۔ ان کی نثر کی اثر آفرینی کا اندازہ نہ صرف مندرجہ بالا اصناف میں نمایاں ہے بلکہ اس ضمن میں ان کے مکتوبات کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ شبلی کی نثر کی خوبصورتی کا برملا اظہار مہدی افادی نے بجا طور پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ :

"عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ان کی حکیمانہ شوخیاں سرمایہ ادب ہوتی تھیں۔" ۱

شبلی نے ماضی سے بھی انحراف نہ کیا بلکہ ماضی کے عظیم نقوش سے مستقبل کے بہترین نقش نکالنے کا کام لیا۔ مکتوب نویس ہونے کے ساتھ انہوں نے سیرت نویسی کے میدان میں بھی نمایاں کارکردگی کا اظہار کیا۔ شاعر ہوکر اپنے زمانے میں حال کو سنوارنے کا بھیڑا اٹھایا۔ غرض اردو ادب شبلی کی گرانقدر خدمات کا مرحونِ منت ہے۔ شبلی کے ادبی کارناموں کا ذکر جہاں ان کے ہمعصر اور معاصر کرتے آئے ہیں وہیں پروفیسر گوپی چند نارنگ

---

۱ شبلی ناقدوں کی نظر میں (مرتبہ) ناز صدیقی، شبلی اپنے خطوط کی روشنی میں (شمس الرحمن) ص۔۳۲۳

بھی شبلی کی ادبی خدمات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے بجا فرماتے ہیں :

"شبلی کے ادبی کارناموں میں ان کی شاعری کا درجہ ثانوی ہے وہ اعلیٰ پایہ کے مورخ، نقاد اور سیرت نویس تھے۔ سیرت نویسی سے ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ماضی کی عظیم شخصیتوں کو مثالی کرداروں کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور مستقبل کو سنوارنے میں ان سے مدد لی جائے۔ ادبی تاریخ سے انہوں نے اپنے لیے فردوسی کا انتخاب کیا اور اس کی شاعری میں شجاعت، صداقت، مردانگی اور بغاوت کے پہلوؤں کو اُبھار کر ماضی کی شمع سے حال کی تاریکی دور کرنے کی کوشش کی۔" ؎۱

۱۸۵۷ء کے بعد اردو نثر کے ارتقا کے ضمن میں سرسید اور ان کے رفقاء میں جن شخصیات نے معاون کردار ادا کیا ان میں محسن الملک نواب سید مہدی علی خان (۱۸۳۷-۱۹۰۷) کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ۱۸۷۰ء میں "آیات بینات" لکھی اس کے علاوہ "مسلمانوں کی تہذیب" "تقلید عمل بالحدیث"

؎۱ ۔ ہندوستانی تحریک آزادی اور اردو شاعری ۔ از ۔ گوپی چند نارنگ : ص۔ ۳۴۴

"کتاب المحبت والشوق"، "مضامینِ تہذیب الاخلاق" مکمل مجموعہ خطبات و مکاتیب وغیرہ میں محسن الملک نے سرسید اور حالی کی سلیس، سادہ اور پُرکشش نثر کی روایت کی تقلید کی نہ صرف یہ بلکہ ان کی نثر میں ایک تو جدیدیت کا عنصر بھی نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے اور دوسرے منطقی استدلال اور تحقیقی وتنقیدی اندازِ بیان ان کی نثر میں توازن اور طاقت پیدا کرتے ہیں۔

سرسید تحریک کے ایک اور بڑے ادیب وقار الملک نواب مشتاق حسین (۱۸۳۹-۱۹۱۷) ہیں انہوں نے ۱۸۷۱ "FRENCH — REVOLUTION & NEPOLEON" کا اردو میں "سرگزشت نپولین بونا پارٹ" کے نام سے ترجمہ کیا اور تہذیب الاخلاق میں تعلیمی، تہذیبی قومی اور مذہبی نوعیت کے مضامین لکھ کر اپنا اہم کردار ادا کیا۔

سرسید تحریک میں وقار الملک کے مقابلے میں جس فنکار نے زیادہ نثری خدمات کیں ہیں وہ ہیں مولوی چراغ علی (۱۸۴۶-۱۸۹۵) مولوی صاحب نے ہر وقت سرسید تحریک کا ساتھ دیا۔ مولوی صاحب جیّد عالم تھے اور عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی پر بھی نظر رکھتے

تھے۔ انہوں نے ایک عیسائی مبلغ کی آتش انگیز کتاب "تاریخ محمدی" کے جواب میں "تعلیقات" تصنیف کی جس سے ان کی عملی و ادبی شخصیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ "اسلام کی دینی برکتیں" اور اسلامیات کے موضوع پر انگریزی میں ایک دو کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا مجموعۂ مضامین "رسائلِ چراغ علی" کے نام سے شائع ہوا اور تہذیب الاخلاق میں بھی بہت سارے مضامین ان کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔ مولوی چراغ علی "منشورِ محمدی" اور "مخبرِ صادق" وغیرہ رسائل کی بھی قلمی معاونت کرتے رہے۔

سر سید کے رفقاء میں مولوی سید احمد دہلوی (۱۸۴۶-۱۹۱۹) کا نام بھی نہایت مشہور ہے۔ انہوں نے ۱۸۹۲ء میں ۵۵ ہزار الفاظ و محاورات پر مشتمل، چار جلدوں والی لغت "فرہنگ آصفیہ" کی تکمیل کر کے اردو کا سب سے لائقِ ستائش کارنامہ انجام دیا۔ یہ فرہنگ اردو کی سب سے قابلِ اعتبار لغت قرار پاتی ہے۔

سر سید کے رفقاء میں سب سے بڑے زود نویس خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی (۱۸۳۲-۱۹۱۰) ہیں۔ انکی تصنیفات کی تعداد ۱۴۳ ہے جو علم و ادب، علم اخلاق، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، طبیعات و ہیئت

اور سیاست وغیرہ جیسے مختلف اور متنوع موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اسکے علاوہ تہذیب الاخلاق اور دوسرے اخبارات ورسائل میں ادب، فلسفہ، سیاسیات معاشیات اور سائنس وغیرہ موضوعات پر سینکڑوں کی تعداد میں ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے خیالات کو چند الفاظ میں سمیٹنے کے گُر سے واقف ہیں۔ ان کے معاصرین نثر نگاروں نے ان کی تقلیل لفظی اور راست گوئی سے کافی فائدہ اٹھایا اور ان کی تقلید کی۔

ان اصحاب کے علاوہ سر سید کے ساتھی شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶۔ ۱۹۱۲) نے اردو نثر میں جدید دور کے بہترین وسیلۂ اظہار کو آزماکر ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی اصناف پر طبع آزمائی کی۔ انہوں نے ۱۸۶۹ء میں مراۃ العروس تصنیف کر کے اردو میں ناول نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ سر سید تحریک میں سر سید، حالی اور شبلی نے سماجی اصلاح اور ذہنی بیداری کا جو فریضہ اپنی تصنیفات سے انجام دیا وہی فریضہ نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے انجام دیا۔ "بنات النعش"، "توبۃ النصوح" "فسانہ مبتلا" "ابن الوقت" اور "دریائے صادقہ" وہ تمام اصلاحی اور مقصدی ناول ہیں۔ ان کے ناولوں میں سماجی، خصوصاً مسلمان گھرانوں کی

سماجی، مذہبی، معاشی اور نفسیاتی الجھنوں، خوبیوں اور خامیوں کی بڑی کامیاب تصویر کشی ملتی ہے۔ نذیر احمد کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کلامِ پاک کا ترجمہ بھی کیا اور "الحقوق والفرائض" "امہات الامہ" "مبادی الحکمت" اور "سموات" وغیرہ نثری کارنامے اردو ادب میں یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی تحریر میں سرسید اور حالی کے اثرات تو دیکھے جا سکتے ہیں، تاہم کوئی جدت نہیں۔

● ترقی پسند تحریک

یوں تو قافلۂ اردو کو آگے بڑھنے کا راستہ علی گڑھ تحریک نے دکھایا۔ تاہم اس تحریک کے بعد دوسری شعوری تحریک ترقی پسند تحریک تھی جس کے اثر سے کاروانِ اردو ادب کو بعض بڑی اہم تبدیلیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جن لوگوں نے زمانۂ حال کے مختلف اور متنوع رجحانات کو اپنی نگارشات کا موضوع بنایا اور اردو زبان و ادب کے دامن کو وسیع کیا اُن کی فہرست طویل ہے ان میں خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، رشیدہ جہاں، احمد علی، بیدی، منٹو، کرشن چندر، جیسے افسانہ نگار اور سردار جعفری، کیفی اعظمی،

مخدوم، احسان دانش اور ساحر لدھیانوی وغیرہ شعرا شامل ہیں۔ اردو شعر و ادب کا ایک گراں بہا ذخیرہ ترقی پسند تحریک کی ہی پیداوار ہے بقولِ علی سردار جعفری:

"ترقی پسند تحریک کا وہ ادب جو وقتی ضرورت کے تحت لکھا گیا تھا۔ تاریخ کا حصہ ہے اور وہ ادب جو زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ تاریخِ ادب کا عظیم کارنامہ ہے اور کوئی استدلال اس کو مٹا نہیں سکتا۔ مستقبل کی راہوں میں یہ ادب مشعلِ راہ ہوگا۔ لوگ ساتھ آتے رہیں گے اور کارواں بنتا رہے گا اور پرورشِ لوح و قلم ہوتی رہے گی۔" ع[1]

ہندوستان میں "ترقی پسند مصنفین" کے نام سے جو تحریک ۱۹۲۵ء میں شروع ہوئی تھی اس کی یہ خصوصیات قابلِ توجہ ہیں کہ یہ ایک ایسی منفرد تحریک تھی جو ایک طرف تو ہندوستان بھر کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں منسلک کرنے کا ذریعہ بنی اور دوسری طرف ہندوستان کی دوسری

ع[1] ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر (ترتیب) پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی۔ ص۔ ۶۸

زبانوں میں بھی اتحاد و اشتراک کا وسیلہ ثابت ہوئی۔ علاوہ ازیں اس تحریک نے کسان اور محنت کش مزدور کو ادب کا ہیرو بنایا اور اس تحریک کی وساطت سے اردو ادب میں کھیتوں کی سوندھی خوشبو اور کسان و مزدور کا پسینہ زندگی کی ابدی قدروں میں شامل حال ہوا۔ محمد علی صدیقی ترقی پسند ادب کی افادیت کا محاسبہ ان بجا الفاظ میں کرتے ہیں:

"ترقی پسند ادب انسانی آزادی کا ادب ہے۔ انسانی مقدر پر استحصالی قوتوں کی علمداری کے خلاف ادب ہے۔ یہ غیر جانبدار ادب نہیں ہے کہ اپنا رخِ زندگی گریز رجحانات کی جانب منعطف کرکے یہ دعویٰ کرے کہ ادیب اجتماعیت پسندی پر یقین نہیں رکھ سکتا کہ اس طرح فنکار کی انفرادیت مجروح ہو جاتی ہے۔ انفرادیت کا تانا بانا تاریخ کی پُراسرار قوتوں سے جا ملتا ہے جو جبریت (FAT-ALISM) کا نظریہ جنم دیتی ہے۔ جبکہ ترقی پسند ادب تاریخ کی پُراسرار قوتوں کی بجائے جدلیاتی مادیت پر قائم ایک ایسا سماجی نظام سامنے آیا جس نے کھلے ہوئے

عوام کو اپنی توجہ کا مرکز اور طاقت کا منبع قرار دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نظام نے ایک ملک کے کچلے ہوئے عوام کو دوسرے ممالک کے کچلے ہوئے عوام کے ساتھ ایک ایسی لڑی میں پرو دیا ہے جو ناگزیر طور پر ایک دوسرے کی معاونت کرتی ہے۔ اس نئے سماجی نظام نے نظریۂ علم ہی کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نظریہ کے تحت پُراسرار قوتوں پر فتح پانے کا وسیلہ بن گیا ہے۔ ادب بھی لازمی طور پر علم اور عمل کے اس "انطباق کلّی" میں ایک فریق بن چکا ہے۔ جو زندگی کی تفہیم اور اس کی بنیاد پر زیادہ موثر کردار ادا کرتا ہے"۔[۱]

ترقی پسند تحریک ادب اردو کی سب سے بڑی مؤثر تحریک ثابت ہوئی اس تحریک کی جڑیں گہری اور فکری جولانیاں کشادہ اور تخلیقی سرگرمیاں وسیع و عریض رہی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی عظمت کا اعتراف اس کے حامی اور مخالف دونوں کرتے آئے ہیں تاہم ہر بڑی تحریک کی طرح کچھ خامیاں اور کوتاہیاں کہیں کہیں اس تحریک میں بھی رہی ہیں اور انہیں نظرانداز

---

[۱] ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر (ترتیب) پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی ص۔ ۷۹

بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یوں تو ادب کی مقصدیت اور افادیت پر علی گڑھ تحریک میں بھی کافی زور دیا گیا تاہم ترقی پسندی نے مارکسی فلسفہ کے زیر اثر ادب کی مقصدیت اور افادیت کو کافی اہمیت دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند ادب میں عام طور پر موضوع اور مواد کو ہی سب کچھ سمجھا جانے لگا اور اس طرح خود بخود ادب کی جمالیاتی اقدار سے صرفِ نظر کیا جانے لگا۔ حالانکہ اگر عالمی ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آئے گی کہ عالمی ادب کے پس منظر میں اس تحریک کے غائر مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مارکسی ناقدین نے ادب کی جمالیاتی اقدار کو ہمیشہ ضرورت کے مطابق ہی اہمیت دی۔ خود مارکس بھی دوسری سرگرمیوں کی طرح ادبی سرگرمیوں کو بھی زندگی کی بنیادی سرگرمیوں میں شمار کرتا تھا ٹیری ایگلٹن اور پیری اینڈرسن نے اپنی کتابوں میں مارکس کو دنیا کے تین بڑے ماہرینِ جمالیات میں شمار کیا ہے دوسرے دو ہیں نطشے اور بام گارٹن۔ لیکن انتہا پسند ترقی پسندوں کی وجہ سے یہ تاثر قائم کیا گیا کہ مارکس جمالیاتی اقدار کے خلاف تھا خود نارنگ نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"ترقی پسند شاعری نے حسن و عشق کے روایتی تصور کو

بدل کر نئی زندگی کے حقائق کی نقاب کشائی کی شاہراہ کھول دی۔ اب شاعری ایک لمحۂ سرخوشی کی یاد نہ رہی بلکہ دردمند دل کی فریاد بن گئی۔ آزادی اور جمہوریت پر زور دیا جانے لگا اور فن میں تجربات کا دور شروع ہوا، جس سے اگر ایک طرف کچھ بے راہ روی پھیلی تو کچھ کار آمد اضافے بھی ہوئے۔ زلفوں کی گھٹا، گردن کی صراحی اور آنکھوں کے پیمانے نئی زندگی کے درد و کرب، اس کے خواب و خیال اور شکست و فتح کا ساتھ نہ دے سکے اور جدید شاعروں نے نئی قسم کی ایمائیت کو فروغ دیا۔ یہ ایمائیت کلاسیکی ایمائیت سے مختلف تھی۔ اس کے اثر سے زبان و بیان میں بے اعتدالیاں بھی برتی گئیں۔ مجموعی طور پر اس دور کی نظم زبان کی سہولیت اور سادگی کے اعتبار سے اہم ہے۔ یہ پیچیدہ علامتوں اور ترکیبوں سے بوجھل نہیں اور اپنے زمانے کی گوناگوں تلخیوں اور بے مہریوں کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی ہے۔ نیز

اپنے قاری سے جڑی ہوئی ہے۔" ؎۱

لیکن یہ سچ ہے کہ بیشتر ترقی پسند تحریک کے حامی کمیونزم کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ جمالیاتی اقدار کو کم۔ ادب کو اکثر اشتہار بازی کے لیے بھی استعمال کیا گیا اور دعوت انقلاب بھی اس طرح دی گئی کہ ادب محض نعرہ بازی کا ذریعہ بن کے رہ گیا۔ اس وقت کی شاعری نے ذہنوں پر انقلابی جذباتیت کے پردے رکھ دیئے اور انسانوں میں جوش و ولولہ کی لہر کو تیز و تند کیا۔ پروفیسر نارنگ ان حالات کا احوال بجا طور پر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

"ترقی پسند شاعروں میں بعض کے ہاں بڑی خطابیت اور قطعیت بھی تھی۔ جس نے ادب کو پروپیگنڈا کی سطح تک پست کر دیا۔ ان میں سے اکثر مقصدیت کے جوش میں انقلاب، کسان اور مزدور کا نام لیکر جذباتی سینہ کوبی کرتے اور نعرہ لگاتے تھے۔ ترقی پسند شاعری کا بڑا حصہ وقتی اور ہنگامی ہو کر رہ گیا۔ اس میں ابال

؎۱۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔ از۔ گوپی چند نارنگ ص: ۴۰۷۔۴۰۸

اور گرمی تو ہے، گہرائی اور روشنی نہیں۔ اس کا اثر وقتی
ہے۔ لیکن وہ وقت ہی ایسا تھا جب سیاسی جدو جہد اور
معاشی ناآسودگی نے ذہنوں کو اس قدر جکڑ رکھا تھا کہ کچھ
مدت کے لئے شعر و ادب کے جمالیاتی تقاضے بھی نظر انداز
ہو گئے۔" ؎۱

مخدوم اپنے جنون کی کیفیت کو اپنی نظم "موت کا گیت" میں اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

؎ تیرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خوں سے سرمایہ داروں کے

کہیں خون کی ہولی کھیلنے کا وحشیانہ اور تند و تیز جذبہ تو کہیں کاخ امراء کے آشیانوں کو اکھاڑنے کی غریبوں کو دعوت دینا نظر آتا ہے۔ لیکن وقت کے دباو کی وجہ سے اس طرح کے اشعار اقبال کے یہاں بھی نظر آتے ہیں۔ ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار کو ہلا دو

؎۱ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری۔ از۔ گوپی چند نارنگ ص ۴۱۲۔ ۴۱۳

ان تمام باتوں کے باوجود یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کے دامن کو وسعت و جامعیت سے بھی بڑی حد تک ہمکنار کیا۔ ترقی پسند دور کے تخلیقی سرمایے میں ایسی نگارشات کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جس کے توسط سے ادیبوں اور شاعروں نے خوابیدہ عوام کو بیدار کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا۔ ان تحریرات کی عمدگی کو بھی ماننا پڑے گا۔ جس میں پیغام عمل بھی ہے اور مارکسی فکر بھی اور اس کے ساتھ ساتھ جمالیاتی خوبیوں سے بھی یہ تخلیقات معمور ہیں۔ اس ضمن میں ذیل کے ان اشعار کو نمونتاً پیش کیا جا سکتا ہے۔

ع متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
(فیضؔ)

ع مدت کے بعد اذان تبسم ملا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے
(احمد ندیم قاسمی)

ع پکارتا ہے اُفق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن

(کیفیؔ اعظمی)

ع آج سے کوچہ و بازار میں مرنا ہے روا
ظلم کی چھاؤں میں جب بیٹھ کے جینا ہے حرام

(سردار جعفریؔ)

غرض ترقی پسند تحریک ادب نے ایک گراں بہا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ آج اگرچہ ترقی پسند تحریک ادب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے پہلے کی بات ہے تاہم اس تحریک نے اردو ادب کی وسعت جامعیت میں ایک فعال کردار ادا کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں اردو شعر و ادب کے دامن کی وسعت کا سبب ترقی پسند تحریک بنی وہیں اردو تنقید کا بھی ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی طرح ترقی پسند تحریک کا مرہونِ منت ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب میں تجربات کو متعارف کرایا اور ان تجربات کو اعتبار عطا کیا۔ اس تحریک نے ادب کو زندگی سے ہم آہنگ کیا اور ادب کے دامن کو اسقدر وسعت بخشی کہ

اس میں ساری کائنات سمٹ گئی۔ اور پہلی بار یہ کائنات حقیقت، واقعیت داخلیت و خارجیت، مواد ہئیت، عوامی غیر عوامی ادب کو زیرِ بحث لاکر ایک نئی سوچ اور ایک عوامی فکر کو تفکر کی دعوت دی۔ اس تحریک نے زبان کے فرسودہ اور بندھے ٹکے نقشِ قدم اور اسلوب و اظہار کے طریقوں کو مسترد کرکے جذبے، تجربے اور محسوسات کو نئے پیرائے میں ادا کیا اور جمالیات کی نئی تفسیر و تعبیر کی۔ اس نے داستان خوانی کی روایت سے انحراف کرکے افسانے کو کام میں لایا اور اس نے سماجی علوم کے دروازوں کو ادب پر وا کرکے عصری بصیرت اور علمی افکار سے ادب کو منسلک کیا۔ ادب ادیب کا محض نشاط اور محفل آرائی و تفریح نہ رہا بلکہ سماجی فریضہ اپنی تحریرات سے انجام دینا بن گیا۔ ادیب نے خواب و خیال کے طلسم سے ادب کو باہر نکالا اور اسے روزمرہ زندگی اور سماجی افکار و خیالات کا ترجمان بنایا۔ ان ہی باتوں کے باعث ترقی پسند تحریک نے ادب میں کچھ خامیوں کے باوجود بھی اردو ادب میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ دیئے۔ ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ ادبی تنقید ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ذہنوں کو اس قابل بنایا کہ تنقیدی بصیرت عام ہوئی۔ اب تک تنقید

کارِ درد والا معاملہ تھا اور رضا اور ماہرینِ علم بدیع و بیان کا کام ہوا کرتا تھا لیکن اب موجودہ ادبی مواد نے سماجی تصویر اور انسانی زندگی کی غماز بن کر ذہنی طور پر سب کو تیار کیا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ چنانچہ اس تحریک کے بنیاد گذار ادیب فکر و فلسفہ کے جدید ترین رجحانات سے آشنا تھے۔ انہوں نے اپنے معاشرے میں تبدّل و تغیّر کا عہد کیا تھا ان کا نعرہ انسانی زندگی، سماجی حالات اور معاشرتی طریق کار میں بہتری لانا تھا۔ ان تمام احساسات و خیالات کو ہم منشی پریم چند کے اس خطبۂ صدارت میں دیکھ سکتے ہیں جو انہوں نے پہلی کانفرنس میں دیا تھا اس میں پریم چند نے کہا۔

"ہماری نگاہِ حسن عالمگیر ہو جائے گی۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کر سکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں، تب ہماری خوددار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے گی۔ تب ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے مطمئن نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور

انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے لیے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔"ع۱

یہ وہ موقف تھا جس کے تحت ہر ادیب و شاعر نے کام کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء اور ادبا کی ایک بڑی صف ہو گئی یعنی مجروح کے بقول لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ ادب کا ایک ایسا ذخیرہ جمع ہو گیا جس میں عام زندگی کے اپنے سماجی اور معاشی خدوخال کے ساتھ مکمل طور پر دیکھا جانے لگا۔ اگرچہ آخر کار اس ادب کا بیشتر حصہ نعرہ بازی اور اشتہار بازی کی فہرست میں شمار ہو گیا تاہم ہر ادیب اور ہر شاعر کے یہاں ایک حساس انسان کی قلب و نظر سے پیدا شدہ خیالات و افکار دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس دور کے شعرا میں مجازؔ، جذبیؔ، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال،

ع۱ ہندوستانی تحریک آزادی اور اردو شاعری (از) گوپی چند نارنگ ص ۲۹۷-۳۹۸

اختر انصاری، مجروح، سلام مچھلی شہری، احسان دانش وغیرہ اگرچہ نوعمر تھے اور رومانیت کے دلدادہ تھے تاہم ان میں سے ہر نوجوان شاعر کے یہاں سنجیدگی بھی عروج پر دیکھنے کو ملتی ہے بقول سردار جعفری :

"یہ سنجیدہ قسم کے نوجوان تھے جو سماجی ذمہ داریوں کا بھی احساس رکھتے تھے اور تھوڑا سا شعور بھی۔ ان کے شعور کی مختلف سطحیں تھیں۔ ان کے تجربے مختلف تھے اور فکریات الگ الگ۔ کوئی گاندھی وادی اور اہنسا کا پرستار تھا، ...... کوئی نہرو کو اپنا ہیرو بنائے ہوئے تھا۔ کوئی کمیونسٹ تھا۔ پھر ایسے نوجوان بھی تھے جو کسی سیاسی مسلک سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک تھی کہ سب کے سب اپنے ملک کی غلامی پر شرمندہ تھے۔"[۱]

ترقی پسند تحریک کے ادب میں یہ خوبی ضرور دیکھنے میں آتی ہے کہ وہاں ایک فرد کی کہانی نہیں ایک مخصوص قوم کا دکھ درد نہیں بلکہ ایک

[۱] ہندوستانی تحریک آزادی اور اردو شاعری از گوپی چند نارنگ ص ۳۹۸

معاشرے میں رہنے والے ان تمام لوگوں کے المیہ سے بحث ملتی ہے جو ایک معاشرے میں ضرور رہتے ہیں مگر مختلف مسلکوں اور مختلف ملتوں سے وابستہ ہیں یہاں بلا لحاظ ملت و مذہب انسان کی تکلیفوں اور دکھوں کا رونا رویا گیا ہے۔ یہاں انسان کی مشکلات کا ازالہ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ انسان دوسرے لوگوں سے انسانیت کا رشتہ رکھتا ہے بقول پروفیسر نارنگ :

" ترقی پسند شاعری کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہماری وطنیت کے دھارے وسیع بنیادوں پر استوار کیے اسے غیر مذہبی بنیادیں دیں اور مذہب و ملت کی بندشوں اور سماجی اونچ نیچ کی پابندیوں سے یکسر آزاد کیا۔ اس نے اپنا رشتہ محنت کش عوام اور پس ماندہ طبقے سے جوڑا۔"[۱]

• جدیدیت و مابعد جدیدیت

جدیدیت

جدید ایک جامع اصطلاح ہے۔ ادب کے حوالے سے جدیدیت کو

۱۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری (از) گوپی چند نارنگ ص ۴۰۷

سمجھنے کے لیے MODERNITY یعنی جدیدیت اور 'MODERNISM'
یعنی جدت پرستی میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ جدت پرستی یعنی -MODER
NISM - کے دو لازمی پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اس اصطلاح کو ابتداً کلیسا
کے حلقوں میں مذہبی اصطلاح کے لیے استعمال میں لایا گیا جس کے
حوالے سے روایت پرستی کے بجائے اجتہاد پر زیادہ زور دیا گیا۔ دوسرا
یہ کہ جدیدیت کی اصطلاح موجودہ دور کے سائنسی یا صنعتی کمالات، ٹیکنالوجی
کی پرستش اور جدید نظریات کی بھی ترجمانی کرتی ہے

بعض لوگ جدیدیت کے عمل یعنی 'MODERNIZATION' کو
مغربیت یعنی WESTERNIZATION کے مترادف سمجھتے ہیں جو بالکل
غلط ہے۔ جدید کاری کافی حد تک مغرب کے راستے پر چلنے کا نام ہے۔
تاہم دونوں میں کافی فرق ہے یعنی دونوں ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اس
ضمن میں جدید کاری کی وہ تعریف پیش نظر رکھی جا سکتی ہے جو جان کوٹسکی
(JOHN KAUTSKY) نے بیان کی ہے۔ انہوں نے جدید کاری
کی خاصی مقبول و معروف توضیح ان الفاظ میں کی ہے۔

"MODERNIZATION IS A PROCESS

BY WHICH A SOCIETY COMES TO BE CHARACTARIZED BY A BELIEF IN THE NATIONAL & SCIENTIFIC CONTROLE OF MAN'S PHYSICAL & SOCIAL ENVIRONMENT & THE APPLICATION OF TECHNOLOGY TO THAT END".

ترجمہ: "جدید کاری ایک عمل ہے جس کی خصوصیت عقلی اور سائنسی ذرائع سے انسان کے طبعی اور سماجی ماحول پر اقتدار اور ٹیکنالوجی کا اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے استعمال ہے"۔ [1]

جدیدیت کا تصور ادبی تنقید کی اصطلاح کا استعمال صرف تاریخ تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک نئی زندگی اور اس کے تغیر پذیر سے نئے معاملات و مسائل سے بھی تعلق رکھتی ہے یہ وہ معاملات و مسائل ہیں

---

[1] جدیدیت اور اقبال (مرتبہ) پروفیسر آل احمد سرور ص۔۱۸

جو تیز رفتار زندگی کے انقلابی انداز سے بدلتے ہوئے رویّوں کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آتے ہیں اور جن کی بدولت انسانی فکر و خیال میں بھی ایک انقلابی انداز پیدا ہوا ہے۔ اس انقلابی انداز سے ادب یعنی شاعری اور نثر بھی متاثر ہوئی ہے اور روایت سے انحراف کے نتیجے میں نئے خیالات اور نئے تصورات سامنے آئے ہیں۔ اس طرح جدیدیت تاریخی اور فلسفیانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہے تاہم جدیدیت مطلق نہیں بلکہ اضافی چیز ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو جدیدیت کی لہر مغرب میں نشاۃ الثانیہ کے بعد شروع ہوئی۔ ہمارے یہاں یعنی ہندوستان میں اس کے نقوش اٹھارہویں صدی کے آخر نصف سے ملتے ہیں تاہم یورپ میں جدیدیت کی تاریخ چار سو سال سے تجاوز کر چکی ہے جبکہ ہمارے یہاں جدیدیت کا رجحان خاصا نو عمر ہے۔ اردو میں جدیدیت کے رجحان نے کافی دیر سے زور پکڑا۔ دنیا میں جدیدیت کے رجحان نے اپنا کام تقریباً انجام دے دیا تھا اور اب اسکی جڑیں مضمحل ہونے لگی تھی کہ اردو میں اس کا چلن عام ہونے لگا بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:-

"جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے جدیدیت تو دنیا میں

دوسری جنگ عظیم کے بعد یعنی ۴۷-۱۹۴۶ء ہی سے
رو بہ زوال ہو گئی تھی، لیکن ہر زبان میں رجحانات و میلانات
ہوں یا تحریکیں، اس زبان کے مخصوص حالات کے
پیش نظر ہی پنپتی ہیں، اردو میں ان تحریکوں کے
ماڈل لاکھ عالمی ہوں لیکن ان کے بعض خصائص اور
TIMINGS خاص ہمارے حالات کے مطابق
ہوں گے۔ سامنے کی بات ہے کہ اردو میں جدیدیت
عین اس وقت شروع ہوئی جب وہ دنیا میں تقریباً
ختم ہو چکی تھی۔" [۱]

اس لئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جدیدیت نے جو رنگ یورپ میں بدلے ہیں ان کے پیچھے کش مکش اور آویزش کی ایک اچھی خاصی تاریخ ہے۔ چنانچہ یورپ کی جدیدیت اور ہندوستان کی جدیدیت کی عمر میں تقریباً ڈھائی سو سال کا درمیانی فاصلہ ہے اسی وجہ سے یورپ کے مقابلے میں ہندوستانی ذہن ابھی مکمل طور

---

۱ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ مرتبہ گوپی چند نارنگ ص: ۳۹

پر جدید نہیں ہو سکا ہے اور اگر ذہن کسی حد تک جدید ہو بھی چکا ہے تاہم قومی مزاج میں ابھی بھی روایت کا اثر و نفوذ باقی ہے مگر چونکہ بیسویں صدی میں صدیوں کا سفر دہائیوں میں طے ہوا اسی لیے پچھلے بیس پچیس برسوں میں جدیدیت کے ہمہ جہت اور ہمہ پہلو اثرات ہمارے یہاں بھی ملتے ہیں۔ اردو میں جدید ادبی تاریخ کا وہ دور جو ۱۹۶۰ء کے بعد تقریباً بیس پچیس برسوں پر محیط ہے۔ یہ دور ادبی تنازعوں اور مناظروں کا بھی دور رہا۔ نئے ادباء شعراء اور نظریہ سازوں نے ادب و تنقید کی جمالیات جب ترتیب دی تو ان کے سامنے کون کون سے چیلنج تھے ان سے واقفیت ہونا اور اس پورے تخلیقی و تنقیدی منظرنامے کا علم ہونا نئی نسل کے لیے لازمی ہے۔ ادباء اور شعراء کے سامنے جو چیلنج اور خدشات تھے ان میں سے پیش رو ادبی مقتدرہ — ESTABLISH-MENT — کی گمراہیوں کو نشانہ بنانا اور انہیں ارفع کرنا بھی مقصود تھا جو عالمی تناظر میں اس وقت قطعی طور پر تازہ کار اور تازہ دم تھیں۔ اگرچہ اس گروہ کی پہچان میں انحراف، اختلاف اور انکار کے پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہیں تاہم یہ اختلاف اور انکار ان عادات و اقدار کا ردِ عمل ہیں

جن کا چلن ادب میں غلط طریقے سے ہو رہا تھا۔ تاریخ و سیاست کے جامع عمل کو اپنی جگہ پر اہم ضرور قرار دیا جا سکتا ہے مگر ادب کو محض انہیں قوتوں کے خول میں مقید نہیں کیا جا سکتا اور اگر وقتی طور پر ادب میں ایسے موضوعات کو داخل کیا بھی جائے مگر ان موضوعات کی دخل اندازی دور تک اور دیر تک ادب کے ہمرکاب نہیں چل سکتی۔ یہ لازمی بات ہے کہ تاریخ، تہذیب اور سیاست کے اطلاق کو مسئلہ بنا کر جب صرف جمالیاتی بنیادوں پر جدیدیت کی تخصیص قائم کی گئی تو اس گمراہی نے بھی جنم لیا کہ ان قوتوں اور ان حقائق کا شعور بھی شاید ضروری نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلی نسل کے جدید ادباء و شعراء کے یہاں جو اشیاء فہمی، حیات و کائنات کا ادراک وسعت اور تنوع ہے۔ اس کے بعد اسکی قابلِ لحاظ توسیع ممکن نہیں ہو سکتی۔ نئے ادباء و شعراء نے علاوہ ازیں اپنی روایت خوش فہمیوں اور مغالطوں سے قطع نظر شعر و ادب کے وسیع تر پس منظر میں جمالیاتی اور بشری قدروں سے متعلق استفسارات بھی پیدا کئے اور ان کے جوابات بھی فراہم کئے۔ ان کاوشوں کے طفیل نئی شعری لسانیات کی آگاہیاں بھی فراہم ہوئیں۔ تخلیقی زبان

نے معنی کے اضافی کردار کے ساتھ ساتھ تخلیقی عمل کو موضوع بحث بنایا اور شعر کے جدید تصورات کے ساتھ ساتھ روایتی نظامِ بلاغت اور نظامِ بدلیعیات سے استفادہ کر کے اپنے استدلال کو استحکام بخشا۔ اس کے علاوہ ان نئے مفکرانہ اور نیم فلسفیانہ افکار و تصورات سے بھی آشنا کیا جنہوں نے جدید فرد کی بصیرتوں کو تو انگر کیا تھا اور ایثار حقایق کی فہم و ادراک کا نیا شعور بخشا تھا۔ اس عمل نے یقیناً نئے ذہنوں میں روایت کی تفہیم کی ایک نئی طاقت بھی پیدا کی۔

اب ان ادباء اور شعراء کی تخلیقی عمر پچاس سال سے تجاوز کر گئی ہے کافی عرصہ تک ان کا چرچہ زور و شور سے رہا۔ انہوں نے ادب کو جو سرمایہ بخشا۔ اس کی قدر و قیمت میں روزافزوں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ ان کی تحریروں میں جن سابقہ تحریروں کے بعض حقائق کو بنیاد بنا کر انحراف یا اختلاف کیا گیا وہ جتنی بامعنی اور پُراثر تھیں اتنی آج نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ادب میں کوئی بھی نظریہ ابدی اور حتمی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ کوتاہیاں اور خامیاں ہر ادبی رجحان میں دیکھی جا سکتی ہیں تاہم جدیدیت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس رجحان

نے نئے سرے سے انسانی ذہنوں کے دریچے وا کر کے سوچنے اور تفکر کرنے کی طرف راغب ضرور کیا۔ تاہم یہ بھی کوئی مکمل نظریہ یا مقدس فرمان نہیں جس سے انحراف یا انکار ممکن ہی نہ ہو۔ اس کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا جا سکتا ہے اور اس کی تنقید بھی ممکن ہے۔ جس کی پیشن گوئی جدیدیت کے سب سے بڑے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی کے یہاں یوں ملتی ہے۔:

"مجھے اس بات میں کوئی خوف نہیں آتا کہ نئے لکھنے والے جدیدیت سے انحراف کریں گے یا کرنا چاہیں گے۔ ادبی اصول و نظریات کو میں ترقی پسندوں کی طرح مطلق اور آفاقی اور ہمہ جہت نہیں سمجھتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ ادب کے بارے میں کئی طرح کے نظریات صحیح ثابت ہو سکیں گے۔ جدیدیت کوئی مذہب نہیں، کوئی الہامی فلسفہ نہیں، جس سے انحراف کفر ہو۔ ایک دن وہ بھی ہوگا جب جدیدیت اپنا کام اچھا برا کر چکے گی۔ کوئی اور نظریۂ ادب اس کی جگہ لے گا۔ میں اس دن

کا منتظر ہوں"۔ ؎۱

ادب کی دنیا میں جدیدیت کا ایک واضح تصور ہے اور یہی اس کی خاص اہمیت کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے یعنی پہلے جس کام کا انجام دینا مذہب یا فلسفہ کے ذمہ تھا۔ اس کو ادب انجام دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب ادب اسے انجام دے سکتا ہے یا نہیں، یہ الگ سوال ہے تاہم یہ بات بلا شبہ کہی جا سکتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی و تنزلی نے عقائد میں کافی انتشار پیدا کئے ہیں اور جہاں اس نے وسعتِ علم، وسعتِ تنظیم اور وسعت طاقت اور بے پناہ یکسانیت، نئے ادارے، نئی ایجادات، ایک عمومیت اور آفاقیت پیدا کی ہے وہیں بے پناہ نئی الجھنیں، نئی مشکلات نئے خطرات اور نئے وسوسے بھی دیئے ہیں یقیناً سائنس اور ٹیکنالوجی اور صارفینیت (CONSUMERISM) کے تمدن نے انسان کو مشینی طاقت معلومات اور دولت عطا کی ہے لیکن اس ترقی یافتہ انسان کے اندر جو مفلوج جاندار موجود ہے۔ اس کو رام کرنے میں کوئی نمایاں

؎۱ ہماری ادبی صورت حال۔ شب خون، بحوالہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص: ۳۹

کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ سائنس نے پرانی بندشوں اور عقائد کی گانٹھ کو ڈھیلا کیا اور نئے تضادات کو معرضِ وجود میں لایا۔ قلبِ انسانی کے لیے مشینی حکومت نے موت کو پیدا کیا اور انسان کے اندر احساسِ مروت اور ہمدردی کو سائنسی آلات نے کچل کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیدا کردہ مشکلات کے ازالے کے لیے بعض لوگوں نے ایک فلسفیانہ بشریت کا سہارا لیا، بعض نے ایک قسم کی وجودیت کا اور بعض نے ہیومنزم کا مگر ان تمام تدبیروں کو آزما کر آخر کار سب نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ انسانیت کے درد کی دوا سائنس و ٹیکنالوجی کے پاس نہیں ہے۔ انسانیت کی بقا کو ایک عقیدے، ایک میلان، ایک فکر اور ایک سمت کی ضرورت ہے اور یہ دوا مذہب یا فلسفہ اب بھی فراہم کر سکتا ہے مگر اس کو دلوں میں اتارنے کے لیے ادب کو سہارا بنا کر کھوئی ہوئی انسانیت کی بازیافت کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ ادب میں جدیدیت کا واضح اور تعمیری تصور، دورِ حاضر میں ادب کے جامع و صالح کردار کا مرکز و محور ہے کیونکہ اسی صالح و جامع کردار پر انسانیت کی بقا منحصر ہے۔ یہ انحصار فقط ادب پر ہی نہیں بلکہ سائنس پر بھی ہے تاہم یہ دونوں لازم و ملزوم

ہیں۔ اگر صرف سائنس کو ہی لے لیا جائے تو سائنس اسے تباہی کی طرف لے جا سکتی ہے اور اگر صرف ادب پر ہی اکتفا کیا جائے، اس کے نتائج بھی ہم پہلے ادوار میں دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے جدید ادب کے مثبت عناصر عرفان پر ادب کا ہی نہیں بلکہ انسانیت کا مستقبل بھی کافی حد تک منحصر ہے۔ سائنس اور ادب جدیدیت کے تناظر میں اب حقیقت کی بازیافت کے دو راستے تصور کئے جا سکتے ہیں۔

غرض اردو ادب میں جدیدیت یک بت ہزار شیوہ ہے اور اسکی تعریف سادے الفاظ میں ممکن نہیں کیونکہ اس میں لاتعداد میلانات کارگر ہیں کچھ لوگ جدیدیت کو سائنس کا عطا کردہ علم اور ٹیکنالوجی کی دین سمجھتے ہیں۔ بعض انسانی فطرت، فرد اور سماج کے بہتر علم، ماضی کے حال میں اور حال کو متاثر کرنے اور بڑھتے ہوئے علم کے ساتھ بڑھتے ہوئے وسوسے اور خطرات کے احساس و ادراک اور بلندیوں میں پستی دیکھنے اور دکھانے کو بھی جدیدیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ہنری جیمس HANERY JAMES کی VISION OF A اور IMAGINATION OF DISASTER بھی۔ جدیدیت کی روایت بڑی ہمہ پہلو WHOLE SITUATION

اور ہمہ جہت ہے۔ اور اس کے عرفان و آگہی کے لیے اسے مغربیت سے الگ ہندو پاک کے اردو ادب کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اردو میں جدیدیت ترقی پسند تحریک کے خاتمے کے وقت اسکی ضد کے بطور ابھری اور اپنے انمٹ مثبت اور منفی نقوش اردو ادب پر چھوڑ گئی۔ ہر تحریک وقت کے دھارے کے ساتھ عروج وزوال کے مرحلوں سے گزرتی ہے۔ جدیدیت کا رجحان بھی وقت کے ساتھ کمزور ہوتے ہوئے تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خیال میں۔

" ترقی پسندی کی طرح جدیدیت نے بھی بیس پچیس برس اردو کو سیراب کیا اور پھر اس کی قوت ختم ہو گئی۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف کہ جب تک اردو میں جدیدیت کا دور تھا، کوئی نظریاتی خلا نہیں تھا۔ جیسے جیسے جدیدیت کمزور ہوتی گئی اور اس میں تکرار و تعمیم کی صورت پیدا ہوئی اور ذہن و شعور

کو انگیز کرنے والی تازگی ختم ہو گئی۔" ع۱

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جدیدیت کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ

۔ مابعد جدیدیت

ادب منجمد نہیں ہوتا بلکہ سیلِ رواں کی طرح بہتا رہتا ہے اور ادبی تحریکات اس میں لہروں کی حیثیت رکھتی ہیں جو ادب کو نئے امکانات سے روشناس کرواتی رہتی ہیں۔ یہ ایک وقت تک اپنا کام انجام دیتی ہیں اور وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت دوسرے کے لیے جگہ چھوڑتی چلی جاتی ہیں، ایسا لازمی بھی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو ہر نئی سوچ، نئی طرز زندگی اور نیا تصور بے کار رہے گا ان پر پہرہ لگے گا اور یوں ادب میں جمود واقع ہو جائے گا۔ اور یقیناً اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ ایسے میں ہر نئی ادبی تحریک کو خوش آمدید کہنے میں ہی دانشمندی ہے تاکہ ادب نئے نئے تجربات اور تصورات سے معمور ہو کر زندگی کے تقاضوں کا سامنا کر سکے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ بحوالہ پروفیسر آل احمد سرور اس بات کی وضاحت بجا طور پر ان الفاظ

ع۱ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ (مرتبہ) پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۳۹۔۴۰

یں کرتے ہیں۔ :

" قدرتی طور پر ادب میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ایک میلان زور پکڑتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ پھر اس کا ردِ عمل شروع ہوتا ہے اور دوسرا میلان سامنے آتا ہے۔ یہ گویا ادب کا قانون ہے۔ جو نئی رو آتی ہے وہ پچھلی رو کی بازگشت نہیں ہوتی بلکہ کچھ اور نئی چیزیں لیے ہوتی ہے۔" ؂۱

(ایوانِ اردو اپریل ۱۹۹۵، ص : ۸)

ہماری زبان اردو اور اس کے ادب نے ہر تبدیلی اور ہر تحریک کا خیر مقدم کیا ہے یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں بلکہ پاس ہی سے اگر دیکھا جائے تو سرسید تحریک پھر ترقی پسندی اور پھر اس کے بعد جدیدیت نے اردو زبان و ادب کے ارتقائی سفر میں جو کردار ادا کئے ہیں ان کی تفصیل پچھلے اوراق پر بیان کی جا چکی ہے اب باری ہے ایک نئے تصور یعنی مابعد جدیدیت کی۔

؂۱ جدید تنقید کا منظر نامہ (مرتبہ) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ص ۵۵۶

اس وقت آرٹ اورادب کے حوالے سے جو عالمگیر مباحثے اور مناظرے ہورہے ہیں۔ ان میں مابعد جدیدیت خاص موضوع ہے اردو میں بھی مابعد جدیدیت زیرِ بحث ہے اوراس تعلق سے دو نقطۂ نظر اپنائے جارہے ہیں ایک موافقانہ اور ایک مخالفانہ۔ موافقت کا جہاں تک تعلق ہے یہ وہ موقف ہے جس کے مطابق علم کو ترقی کے وسیلے کے طور پر قبول کیا جاتا ہے اور جہاں تک مخالفت کا تعلق ہے۔ مخالفت کرنے والے یا تو اسے سمجھنے کے لیے تیار نہیں یا وہ سمجھتے ہیں کہ باقی ماندہ سابقہ تصورات بھی ان کے ہاتھوں سے نکل رہے ہیں اور وہ صرف یہ کہہ کر اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ مابعد جدیدیت ایک مغربی نظریہ ہے جو فقط سرمایہ دارانہ نظامِ فکر سے عبارت ہے۔ یہ احباب مارکسیت اور ترقی پسندی کو بھی سائینسی نقطۂ نظر سے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو کے انہیں صاحب طرز اشخاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ :

"ہندوستان میں مابعد جدیدیت کی بحثوں کو شروع ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں لیکن اگر اردو والوں سے پوچھا

جائے کہ مابعد جدیدیت ۔POST MODERN
ISM ۔ کیا ہے تو اکثر لاعلمی کا اظہار کریں گے۔ اردو میں یہ بحث ابھی نئی ہے۔ جو لوگ حساس ہیں اور ادبی معاملات سے آگہی رکھتے ہیں ان کو اس بات کا احساس ہے کہ مابعد جدیدیت کا نیا چیلنج کیا ہے۔ اردو کے تناظر میں مابعد جدیدیت کے اثرات کے تحت پیدا ہونے والے نئے سوالات کیا ہیں اس بارے میں پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کسی ایک وحدانی نظریے کا نام نہیں بلکہ مابعد جدیدیت کی اصطلاح احاطہ کرتی ہے مختلف بصیرتوں اور ذہنی رویّوں کا جن سب کی تہہ میں بنیادی بات تخلیق کی آزادی اور معنی پر بٹھائے ہوئے پہرے یا اندرونی یا بیرونی دی ہوئی لیک کو رد کرنا ہے ۔ یہ نئے ذہنی رویّے نئی ثقافتی تاریخی صورتِ حال سے پیدا ہوئے ہیں اور نئے فلسفیانہ قضایا پر مبنی ہیں۔" [۱]

---

۱ جدید تنقید کا منظر نامہ از ڈاکٹر الطفی کریم ص: ۵۵۶

موجودہ دور میں نظریات برق رفتاری سے بدل رہے ہیں۔ زبان ادب اور آرٹ کے معیار کے ساتھ ساتھ فکر کا دھارا کسی خاص محور پر مرکوز نہیں بلکہ اس میں بھی تبدیلی، ترقی اور توسیع ہوتی رہتی ہے اور اسی تبدیلی سے نئے نئے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس لیے ادب اور آرٹ میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ادب زمانے کی تبدیلی کا سبب کا ہے۔ ادب میں مابعد جدیدیت کے اثر و نفوذ کا جواز بھی یہی ہے اور بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

> "مابعد جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورتحال ہے یعنی جدید معاشرے کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی حالت نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی رویے یا معاشرتی و ثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی جو کرائسس کا درجہ رکھتی ہے۔"[1]

لہذا مابعد جدیدیت اس صورت حال کا جزو لاینفک ہے مگر اس سلسلے میں اتنے اختلافی بیانات جاری کیے جا رہے ہیں کہ قاری کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے کہ کس بات کو درست سمجھے اور کس بات کو غلط۔ مابعد جدیدیت

1. ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت (از) پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ ص ۵۶

کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ سب سے پہلے بعض متشابہہ لفظوں کے معنوی فرق کی وضاحت کی جائے مثلاً "جدید اور جدت یعنی (MODERN & MODERNISM) کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پنجابی میں جدیدیت کی مخالفت ہوئی تو مابعد جدیدیت، کو بھی اسی تصور یعنی "جدیدیت" کی کڑی کے طور پر سمجھا جانے لگا۔ اور نتیجتاً بنا سوچے سمجھے اسے بھی مخالف تصور کیا جانے لگا اس طرح ان اصطلاحات کی خلط ملط تعبیر و توسیع نے ادب میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کو جنم دیا اور مابعد جدیدیت کی اساسی اقدار سے بسا اوقات انصاف نہیں ہو پایا۔ لہٰذا مابعد جدیدیت' کو سمجھنے کے لیے ان چیزوں میں امتیاز قائم کرنا از حد لازمی ہے بقولِ پروفیسر قدوس جاوید:

> "مابعد جدید ادب کیا ہے اور کیا نہیں اسے سمجھنے
> کے لیے اول تو جدید (MODERN) جدت پسندی
> (MODERNITY) جدیدیت (MODERNISM)
> جدید کاری (MODERNISATION) اور مابعد جدیدیت

(POST MODERNISM) جیسی ملتی جلتی
اصطلاحوں کو ان کے تمام تر تاریخی، سماجی، فلسفیانہ
اور ثقافتی تناظرات اور امکانات کے ساتھ سمجھنا
ہوگا اور پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ اٹھارہویں صدی کے
"روشن خیالی" کے فلسفیانہ منصوبہ ارتقا -ENLIG)
-HTENMENT PHILSOPHICAL-PROJECT OF-
(DEVELOPMENT : انیسویں صدی کے جوابی روشن
خیالی "COUNTER ENLIGHTENMENT" اور انیسویں
صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل کی جدیدیت
اور اینگلو امریکن ہائی جدیدیت -HIGH MODE)
(RNISM - کا آپس میں افتراق یا مماثلت کا کیا
رشتہ ہے اور پھر ان سب کا مابعد جدیدیت کے
ساتھ کیا تعلق ہے۔" ع۱

اصل میں انفارمیشن ٹیکنالوجی (INFORMATION TECHNOLOGY) اور

ع۱ بازیافت: مجلہ شعبۂ اردو۔ یونیورسٹی آف کشمیر سرینگر ۱۹۹۹، ص: ۸۸

کنزیومرازم (CONSUMERISM) کی وساطت سے گلوبلائزیشن کی وجہ سے مابعد جدید تصور کے روز افزوں فروغ نے عالمی سطح پر مابعد جدید ادب (POST MODERN LITT.) کے تصور کو بھی اس قدر عام کیا ہے کہ اب مابعد جدیدیت عصری ثقافت، اخلاقیات، مذہب اور فلسفہ کی طرح ادبی فکر کا بھی لازمہ بن گئی ہے۔ لہٰذا اردو میں مابعد جدیدیت کے حوالے سے تازہ کار تحریک ماننے پر یا اس بات کی نفی کرنے پر بحث ہوتے رہنا فطری امر ہے اور آگے بھی ہونے کے امکانات واضح طور پر نظر آتے ہیں تاہم اولاً یہ لازمی ہے کہ مابعد جدیدیت اور مابعد جدید ادب کے رجحان کو لے کر جو غلط فہمیاں عام ہیں ان کا ازالہ کیا جائے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ مابعد جدیدیت کے معنی، تعریف اور توضیح کے حوالے سے مختلف و متضاد بیانات سامنے آرہے ہیں جن میں جہاں بعض اصحابِ نقد کی ٹھوس اور مدلل تحریریں صورت حال کو واضح کر رہی ہیں وہیں بعض دوسرے ناقدین کی غیر واضح تشریحات عام قارئین کو مابعد جدیدیت کے تئیں گمراہ کن تعبیرات کا مرتکب کر دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہونا فطری بات ہے، بلکہ مابعد جدید ثقافتی حالات کے ساتھ مطابقت

رکھتا ہے کہ افتراق اور تضاد مابعد جدید ثقافتی صورت حال کا خاصہ بھی ہے تاہم اس بات پر سبھی اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کی حقیقت کو ان وجوہات کی بنا پر جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مابعد جدیدیت کا رجحان یقیناً قاری کی ذہانت کے دریچے وا ہونے کا تقاضا کرتا ہے تاکہ وہ (قاری) اس کے ساتھ مکمل طور پر انصاف کر سکے اور اسے اپنے معنی و مفہوم اور تعریف و توضیح کی رو سے بغیر تضاد و اختلاف کے برتا جائے اور ایسا ایک عمیق نظر قاری ہی کر سکتا ہے۔ تاکہ مابعد جدیدیت میں پنہاں انسانی زندگی کے فلاح و بہبود کا صحیح مطالعہ کیا جائے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ دانشمندانہ پیرائے میں مابعد جدید ثقافتی صورتحال کے حوالے سے۔ بجا طور پر لکھتے ہیں کہ:

"نئی فکر یا مابعد جدیدیت میں بہت سی باتیں دقّت طلب ہیں۔ ایسا اس لئے بھی ہے کہ جن لوگوں کی واقفیت سرسری ہے یا جو نئے خیالات سے بھڑکتے ہیں، وہ عمداً انتشار بھی پھیلاتے ہیں یا آدھی ادھوری یا غلط سلط باتیں بھی کرتے ہیں۔ کسی بھی بڑی تبدیلی

کے زمانے میں ایسے رویے بالعموم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر سچ ہے کہ جس طرح اپنے اپنے زمانے میں مارکس نے تاریخ کو بے مرکز کر دیا تھا، بالکل اسی طرح سوسیئر نے زبان کو، ہوسرل نے روایتی اعتقادات کو اور دریدا نے معنی کی روایتی وحدت کو بے دخل کر دیا ہے۔ نتیجتاً پہلے سے چلے آ رہے بہت سے تصورات جن کو انسان پہلے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتا تھا۔ اب چیلنج کی زد میں آ گئے ہیں۔ علم و دانش کی یہ تبدیلی معمولی تبدیلی نہیں۔ مسئلہ فقط ادب یا ادب کی تعبیر اور تشکیل کا نہیں، انسان اور انسان کی زندگی کا ہے، یعنی حقیقتِ انسانی کی نوعیت، انسان کی شناخت یا انسان کی تیزی سے تحلیل ہوتی ہوئی پہچان کا ہے؛ نیز مابعد جدید عہد میں ماس میڈیا اور صارفیت کی جو یلغار ہے اور جس طرح کمپیوٹر اور برقیاتی ذہن بہت سی ثقافتی ترجیحات

کو پلٹتا جا رہا ہے، اس سے چاروں طرف زبردست
تبدیلی ہے۔ مابعد جدیدیت یا نئی فکر کے بہت سے
ذہنی رویے اس نئی حقیقت کو سمجھنے اور اس سے
عہدہ برآ ہونے کی کوشش ہیں۔" ۱

پروفیسر وہاب اشرفی نے مابعد جدیدیت کی "تعریف" کے حوالے سے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ

" مابعد جدیدیت کی ساری بحث ساختیات اور
اس کے متعلقات موافقانہ یا معاندانہ میں مضمر ہے
فاولر کشمکش میں ہے کہ POST-STRUCTU-
RALISM- کی کیسے تعریف کرے۔ میری الجھن
یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کی حتمی تعریف ممکن ہی نہیں۔
مغرب میں مابعد جدیدیت "پس ساختیات" کے ساتھ
آگے کا مرحلہ ہے۔ ہمارے ہاں مابعد جدیدیت،

---

۱ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات از گوپی چند نارنگ ص۔ ۶۱۶

جدیدیت سے آگے کا مرحلہ ہے"۔ ع۱

اردو کے ایک مشہور نقاد دیویندر اسر نے مابعد جدیدیت کو مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان میں بنیاد پرستی (FUNDAMENTALISM.) احیا پرستی اور کٹر پن کو فروغ دینے والی قوت کے طور پر دیکھا ہے اور سوال قائم کیا ہے کہ

"کیا مابعد جدیدیت مشرق کے ممالک میں بنیاد پرستی اور احیا پرستی کی قوتوں کو مضبوط نہیں کر رہی۔؟۔ کیا دونوں فریقین' مابعد جدیدیت کے حامی اور مخالف۔ اس کٹر پرست رویے کی حمایت نہیں کر رہے۔"ہندوتو" کے نام پر یہ احیا پرستی کلیت کی حامی "تہذیبی قوم پرستی CULTURAL NATIONALISM کی صورت اختیار کر لیتی ہے"۔ ع۲

ڈاکٹر وزیر آغا نے' مابعد جدید تصور ادب کی اہمیت کا اعتراف کرنے کے

ع۱ پروفیسر وہاب اشرفی مضمون۔ مابعد جدیدیت' بحوالہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ ص ۲۱

ع۲ دیویندر اسر مضمون۔ مابعد جدیدیت، مغرب اور مشرق میں مکالمہ۔ مشمولہ۔ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ ص ۱۱۷

باوجود ابتدا میں اردو میں مابعد جدیدیت کے انطباق سے متعلق خطرات اور اندیشوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"چونکہ مابعد جدیدیت مغرب کی سائکی کی پیداوار ہے جو مشرق کی سائکی سے ایک الگ اور جدا مزاج رکھتی ہے لہذا میرا خیال ہے کہ اردو میں مابعد جدیدیت کے اس خاص مزاج کے فروغ پانے کے امکانات بہت کم ہیں۔ جو مغرب میں عام ہوا ہے۔ اس لیے .... مابعد جدیدیت کا لیبل لگانے سے ویسی صورت حال کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے مارکسیت جدیدیت اور ساختیات کے لیبلوں کے باعث پیدا ہوئی تھی۔" ؎۱

لیکن وزیر آغا نے اپنی رائے کا اظہار آج ایک دہائی قبل کیا تھا جب مابعد جدیدیت اور مابعد جدید ادب کے معنی و مفہوم پر ابھی دھند باقی

؎۱ ڈاکٹر وزیر آغا، مضمون۔ مابعد جدیدیت۔ احیا اور ارتقاء۔ مشمولہ۔ سہ ماہی اثبات و نفی کلکتہ۔ جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۸ء ص ۲۴

تھی لیکن اب جبکہ یہ دھند چھٹ چکی ہے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں مابعد جدید تصورِ ادب نہ صرف اپنی جگہ بنا چکا ہے، اس کا فروغ ہو رہا ہے بلکہ مابعد جدیدیت کی توضیح و تعبیر بھی یقین کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کا یہ اقتباس مابعد جدید تصورِ ادب سے متعلق تمام اندیشوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔

مابعد جدیدیت ادب کا ایک توسیعی تصور ہے۔ ایسا تصور جو اپنے صد پہلو انسلاکات کی بنا پر کسی ٹھوس اور حتمی "تعریف" (DEFINITION) کی گرفت سے ماورا تو ہے لیکن توضیح و تعبیر کے دائرے سے صد فی صد باہر بھی نہیں لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ۔

"سماجی و ثقافتی لہروں کی آگہی معاشی و تاریخی نشیب و فراز اور فلسفیانہ موشگافیوں کے شعور نیز مابعد جدید علمی، لسانی، فلسفیانہ اور ادبی تھیوریز کے مختلف و متضاد سیال اور مرکز گریز نکات کی تفہیم و تعبیر کے مرحلوں سے گذر کر آج کا انسان۔ جس نئی "ثقافتی صورتحال"

تک پہنچا ہے اس صورت حال کو "مابعد جدیدیت" کہتے ہیں اور جب اس نئی صورت حال کے تضادات اور مشابہات کے اندر رہتے ہوئے متن، موضوع، زبان زندگی، زمانہ، مصنف، مہابیانیہ اور قاری کے حوالے سے حقیقت اور معنی کی رمزیات، تکثیریت اور لامرکزیت مفروضات اور امکانات کی تخلیقی و جمالیاتی تشکیل یا ردِتشکیل کرنے والی کوئی تحریر فنی تقاضوں کے تحت وجود میں آتی ہے تو ایسی تحریر کو مابعد جدید ادبی تحریر کہتے ہیں اور ایسی تحریروں پر مشتمل ادب کو "مابعد جدید ادب"۔

• گوپی چند نارنگ اور مشرقی شعریات

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک اہم کارنامہ مشرقی شعریات کے مختلف مباحث سے متعلق غور و فکر کی تازہ کاری ہے پروفیسر نارنگ نے اپنی کتاب ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات میں سنسکرت عربی اور فارسی شعریات کے ان مباحث یعنی لفظ و معنی کا رشتہ، معنی و بیان، کذب و مبالغہ، فصاحت و بلاغت، صنعت کاری، تصورِ لسان و شعر، نظریۂ شونیہ، نظریۂ اپوہ، سپھوٹ، دھونی رس وغیرہ کے بارے میں اردو شعریات اور مغربی شعریات کے حوالے سے اپنے نتیجہ خیز تصورات پیش کئے ہیں۔ پروفیسر نارنگ کے ان تصورات سے اردو تنقید میں شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر کے امکانات وسیع سے وسیع تر ہوئے ہیں اور اردو تنقید کو شعر و ادب کے جائزے کے لیے قدیم کے ساتھ ساتھ جدید میدان بھی میسر آیا ہے۔ عام طور پر اردو تنقید فن اور فنکار شناسی کے عمل میں مشرقی اور خصوصاً سنسکرت شعریات کو نظر انداز کرتی رہی ہے لیکن پروفیسر نارنگ نے عربی اور فارسی کے

ساتھ ساتھ سنسکرت شعریات میں موجود زبان وادب اور تخلیقِ شعر سے متعلق مختلف تصورات کو تفصیل کے ساتھ پیش کر کے اردو تخلیق وتنقید کو وسعت بخشی ہے۔ مشرقی شعریات (خصوصاً سنسکرت شعریات) میں جن اہم نکات سے بحث کی گئی ہے اور پروفیسر نارنگ نے انہیں جس انداز میں پیش کیا وہ مسرت بخش بھی ہے اور بصیرت افزا بھی۔ ضروری ہو جاتا ہے کہ پروفیسر نارنگ کے ان تصورات کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے۔

لفظ و معنی کا رشتہ

لفظ و معنی کے رشتے کی بحث مشرقی شعریات کی بنیادی بحث ہے۔ اس سلسلے میں نارنگ نے عربی اور فارسی دانشوروں کے یہاں لفظ و معنی کے رشتے کی بحث پر اسطرح سے تبصرہ کیا ہے۔

> "یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں ان سے الگ الگ بحث کی جا سکتی ہے' اور ایک کو دوسرے پر اور دوسرے کو پہلے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ لفظ و معنی کی یہ مثنویت ایک مرکزی رو کی طرح پوری عربی فارسی

روایت میں جاری وساری ہے، اگرچہ اس کے رد کے
امکانات ہیں، لیکن وہ اس قدر مضبوط نہیں ہیں جتنے
توثیق کے امکانات مضبوط ہیں۔ یہاں حتی الامکان تمام
مقامات کا احاطہ اس لئے کیا گیا کہ یہ ثنویت عربی
فارسی روایت کا مرکزی مبحث ہے اور آیندہ کی
بحث کے لیے بھی اس کا نظر میں رہنا ضروری ہے۔"[۱]

عام طور پر چونکہ اردو کے قارئین سنسکرت شعریات سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اس لیے پروفیسر نارنگ نے تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے سنسکرت میں لفظ و معنی کے رشتے کی بحث پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

"لفظ کی سب سے بڑی طاقت اس کی معنی خیزی ہے
اس طاقت کو شکتی کہا گیا ہے۔ شکتی وہ طاقت ہے جو
شبد (لفظ) کو ارتھ (معنی) سے جوڑتی ہے۔ شبد اور ارتھ
کے رشتے کے بارے میں ہندوستانی شعریات میں دو نظریے

۱۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات از گوپی چند نارنگ ص: ۴۱۹

ہیں : میمانسا والوں کا کہنا ہے کہ شبد کا ارتھ سے رشتہ فطری ہے۔ جب کہ نیایے والوں کا کہنا ہے کہ شبد کا ارتھ سے رشتہ فطری نہیں ہے بلکہ یہ رشتہ رسمی اور روایتی نوعیت رکھتا ہے۔ میمانسا والوں نے میمانسا سوتر میں یہ بحث اٹھائی ہے کہ معنی کا اصل سراغ لگانا چوں کہ ناممکن ہے، اس لیے۔

معنی و بیان

علم بیان سے مراد وہ علم ہے جس میں کسی معنی کو نت نئے انداز سے ادا کیا جائے۔ علم بیان سے ہمیں یہ سیکھنے میں مدد ملتی ہے کہ کس طرح مختلف طریقوں میں کسی بات کو بیان کیا جا سکے کہ ایک معنی دوسرے معنی سے زیادہ لطیف اور واضح ہوں۔ یعنی ایک ہی معنی کو مختلف طریقوں سے کس طرح دلیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ علم بیان کی مدد سے اظہار کے ان طریقوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جن کے ذریعے کسی واقعہ، حالت، کیفیت یا خیال کی مکمل اور صحیح تصویر کشی کی جائے اور مخاطب کا ذہن متکلم کے مافی الضمیر تک پہنچ جائے یعنی کسی خیال کو یا کسی بات کو مختلف طریقوں

سے اس طرح بیان کرنا کہ اس کی ترسیل کا مقصد بھی پورا ہو اور اس میں اثر آفرینی، لطف اور جدت خیال کے علاوہ ایجاز بھی پیدا ہو۔ علم بیان اور علم معنی کے باہمی تعلق کو پروفیسر نارنگ یوں بیان کرتے ہیں۔

"گویا علم معنی کی تعریف علم بیان کی مدد کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی یا دونوں ایک دوسرے کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں، تو پھر دونوں میں کیا فرق ہے یہ بھی غور طلب ہے کہ دلالت وضعی (یا دلالتِ عقلیہ یا دلالتِ غیر لغوی) کی جو بات کی جا رہی ہے کیا یہ وہی CUT نہیں جواز روئے علم بیان حقیقت اور مجاز میں ہے۔ اور بغیر حقیقت کی بحث کے زبان میں مجاز قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ گویا مشرقی شعریات کی اس روایت میں علم معنی وہی ہے جو علم بیان میں حقیقت کا یا دلالتِ وضعی کا بیان ہے۔ اگر کوئی فرق ہے اور وہ ایسا فرق نہیں تو وہ یہ کہ علم معنی مفرداتِ الفاظ سے بحث کرتا ہے اور علم بیان میں مفردات کی قید

نہیں گویا علم بیان جملہ کلام کو حاوی ہے"۔ ؎۱

فصاحت و بلاغت

فصاحت ایک صورتِ حال ہے۔ فصاحت سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ الفاظ و محاورات یا فقروں کو اسطرح بولا یا لکھا جائے کہ یہ تاثر پیدا ہو کہ مستند اہلِ زبان بولتے یا لکھتے ہیں۔ اس لیے فصاحت کا تصور زیادہ ترسمی ہے۔ چنانچہ فصاحت کا تصور بدلتا رہتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد روزمرہ پر ہے یہی وجہ ہے کہ فصاحت کے حوالے سے کوئی دلیل پیش کرنا یا کوئی اصول وضع کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ تصور فصاحت ساکن یا منجمد نہیں۔ اس میں بھی زمانے کے ساتھ ساتھ تغیر واقع ہوتا ہے۔ اور الفاظ بھی وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ فصیح غیر فصیح ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ فصاحت کی تعریف کے حوالے سے یوں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہیں۔:

> "فصاحت کی بھی جتنی تعریفیں ہیں ان میں سے کوئی قائم بالذات نہیں، یعنی معائب کو منہا کرتی ہیں، محاسن

؎۱ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات از پروفیسر گوپی چند نارنگ ص: ۳۴۴

کا تعین نہیں کرتیں۔ بہ ایں ہمہ ان سب میں کسی نہ کسی چور
دروازے سے قاری کا تصور اور اس کا تفاعل در آتا ہے۔
یہ غور طلب ہے۔"[1]

اب جہاں تک بلاغت کا تعلق ہے بلاغت لغوی معنوں میں "تیز بیانی" کو کہتے ہیں۔ بلاغت زبان کا تصور ہے۔ بلاغت سے مراد ہے کلام سے کچھ مراد لینا اور اس میں مرتبۂ کمال کو پہنچنا۔ مرتبۂ کمال سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ جس کلام میں یہ مرتبہ نہیں وہ بلیغ نہیں چنانچہ اگر مذکورہ بالا الفاظ میں بلاغت کو ایک تصور قرار دیا گیا ہے تو مرتبۂ کمال بھی ایک تصور ہی ہے یعنی جس کلام میں دوسروں تک پہنچنے کی جتنی صلاحیت ہوگی وہ اتنا ہی بلیغ ہوگا۔ بقولِ پروفیسر نارنگ:

"بلاغت میں فصاحت کا تصور مضمر ہے بلکہ فصاحت شرط ہے بلاغت کی۔ بالعموم بلاغت کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ بلاغت کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا ہے۔"[2]

---

[1] ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات از گوپی چند نارنگ ص ۴۶۳
[2] ایضاً ص ۴۶۴

کذب و مُبالغہ

شعر میں کذب اور مبالغے کا ہونا قدامہ نے ان الفاظ میں لازم قرار دیا ہے کہ " اَحسَنُ الشِعرِ اَکذَبُہُ " یعنی سب سے اچھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو۔ شعر میں مبالغہ ہونا شعر کی اچھائی کو ظاہر کرتا ہے تاہم اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ غلو صداقت پر مبنی نہ ہو یعنی مبالغہ شعر کے حسن کو دوبالا کرنے کی غرض سے کیا جائے۔ شعر میں کذب و مبالغے کی اہمیت کو پروفیسر نارنگ نے حسان بن ثابت کے ایک شعر کے حوالے سے جس میں ثابت نے واضح کیا ہے کہ "سب سے اچھا شعر وہ ہے جب سنا جائے تو لوگ کہہ اُٹھیں کہ سچ کہا ہے"۔ یوں بیان کیا ہے۔ :

"... مبالغہ خواہ کتنا ہو لیکن صناعتِ شعری اس درجہ ہو کہ سننے والے کہہ اٹھیں کہ سچ ہے خاطر نشان رہے کہ مبالغہ یعنی فضائل و رزائل یا محاسن و معائب کے بیان میں غلو جو مبنی بر صداقت نہ ہو، قبائلی زندگی سے یادگار تھا اور معیارِ شعر کی بحث میں اسکو رد تو کجا اُسے حسنِ بیان کیلئے ضروری سمجھا جاتا رہا"[1] ●●

---

[1] ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات از گوپی چند نارنگ ص: ۴۱۲

باب چہارم

گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

(الف) اردو کی لسانی و شعری روایات کے حوالے سے

اور (ب) اسلوبیات کے حوالے سے

فعال اور تاریخ ساز ناقدین کی فہرست تیار کی جائے گی تو پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ نارنگ کم و بیش پچاس برسوں سے لگاتار اردو تحقیق و تنقید کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر نارنگ صاحب کے مطبوعہ اور معلوم تنقیدی کارناموں کی طویل فہرست پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اردو شعر و ادب کی لسانی اور ادبی روایات سے لے کر بدلتے ہوئے ثقافتی حالات اور نظریات کے تناظر میں ہر دور میں شعر و ادب کا تنقیدی جائزہ روایتی لیک سے ہٹ کر نئے انداز میں تازہ عصری، ادبی و ثقافتی اقدار اور صورت حال کی روشنی میں لیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ یہ مانتے ہیں کہ نظریات اور طریق کار میں اختلاف و افتراق کا ہونا کسی بھی زبان کے ادب کے لیے سودمند ہی ثابت ہوتا ہے۔ انہوں نے

واضح لفظوں میں کہا ہے کہ :

"ادب پنپتا ہے انحراف و اجتہاد و اختلاف سے
یہ کھیل ہی افتراق و انفراد کا ہے"۔ ۱؎

یعنی پروفیسر نارنگ بجا طور پر یہ مانتے ہیں کہ ادب میں تغیّر و تبدّل کا رونما ہوتے رہنا فطری بھی ہے اور ادب کے "پنپنے" کے لیے ناگزیر بھی، لیکن نارنگ صاحب تغیّر و تبدّل کو اپنانے کے معاملے میں توازن و تناسب برتنے پر اصرار کرتے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ "پیڑ" کے نئے گل بوٹوں کی پسندیدگی اور پذیرائی کو فطری اور ضروری قرار دیتے ہیں لیکن "انتہائے شوق" میں پیڑ کی ان جڑوں کو ہی نقصان پہنچانے کے رویّے کی زبردست اور پُرزور مخالفت بھی کرتے ہیں۔ جن پر پیڑ قایم ہے۔ اسی طرح پروفیسر نارنگ نے دیگر جدید ناقدین مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کی طرح ترقی پسندی اور ترقی پسند ادب کو سارے کا سارا رد نہیں کیا بلکہ خامیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ خوبیوں کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

"بعض ترقی پسندوں نے بھی ادب کے فنی تقاضوں کا لحاظ

۱؎ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ (مرتبہ) گوپی چند نارنگ ص:۲۰، اشاعت ۱۹۹۸

کیا اور اعلیٰ درجے کا ادب پیش کیا۔ لیکن اس میں کلام نہیں
کہ عام فضا یہ تھی کہ ادب سے اشتہار کا کام لیا گیا
بس یہ کمی اور کوتاہی تھی جو ترقی پسندی میں واقع ہوئی
.... سوویت یونین پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو گئی مارکسزم
کی آزاد تعبیروں اور سوشلزم کی معنویت ختم ہو گئی ہو
ایسا بھی نہیں بلکہ یہ معنویت آج کی دنیا میں بالخصوص
تیسری دنیا کے ملکوں میں اور ہندوستان میں پہلے
سے زیادہ ہے۔"[۱]

گوپی چند نارنگ نے ہر دور میں شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر سے متعلق تازہ افکار و خیالات اور نظریات کا خیر مقدم کیا ہے کیونکہ وہ یہ مانتے ہیں کہ :

"انسانی فکر میں کوئی بھی منزل آخری نہیں۔ سچائی کی
تعبیریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ہر انحراف کسی سابقہ
موقف سے انحراف ہوتا ہے۔ جس طرح نئی فکر کا موجود

---

[۱] اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ

انحراف سابقہ فکری رویّوں سے ہے اسی طرح آئندہ
کا انحراف اگر کسی سے ہوگا تو موجودہ تھیوری سے
ہوگا۔ وقت بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے۔ کوئی چاہے
بھی تو ایک ہی دریا میں دوبار قدم نہیں رکھ سکتا۔" [۱]

دراصل یہی وہ صاف و شفاف اور جامع شعور ہے جو پروفیسر گوپی چند نارنگ کے لیے شعر و ادب کی قدر سنجی کے مرحلوں کو آسان بناتا ہے۔ دوسری جانب انہیں سابقہ اور حالیہ نقادوں سے منفرد و ممتاز بھی بناتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نارنگ سے پہلے ترقی پسند ناقدین نے ادب کی سماجیات پر اصرار تو کیا لیکن ترقی پسندوں کے یہاں سماجی شعور کو فنکار کے تخلیقی شعور پر ادعائی طور پر مسلّط کرنے اور فن کو شعوری موضوع میں تبدیل کرنے پر اصرار ملتا ہے۔ اسی طرح جدیدیت نے فن اور فنکار کی آزادانہ حیثیت پر تو زور دیا لیکن فن کے سماجی منصب اور انسلاکات سے شدت کے ساتھ انکار بھی کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید ادب کا اپنی زمین اپنی روایات سے رشتہ ہی منقطع ہوگیا، چنانچہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ہی ہیں جنہوں نے

---

[۱] ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات از پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۲

۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کے رجحان کی حمایت کی تھی۔ ۹۰-۱۹۸۵ء تک آکر جدیدیت کی خامیوں کی نشاندہی کی اور اس کی تمام بنیادی شقوں کو دلائل کے ساتھ رد کر دیا۔ پروفیسر نارنگ نے ادب کے سماجی انسلاکات کی حمایت کرتے ہوئے ادب کی شعریات سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا کہ :

"زندہ زبانوں کی ثقافت ہو یا شعریات یہ اندر سے بند نہیں ہوتیں۔ نئے اور پرانے آویزش و پیکار سے ان میں خود انضباطی اور ہم آہنگی کا جدلیاتی عمل برابر جاری رہتا ہے اور سابقہ بنیادوں پر نئے معیار بنتے رہتے ہیں اور سابقہ معیاروں کی بازآفرینی بھی ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر آج کی اردو شعریات سو فی صدی وہ نہیں ہے جو حالیؔ، آزادؔ، شبلیؔ، یا نذیر احمد کے زمانے کی شعریات تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے حالیؔ اور ان کے معاصرین کی شعریات بھی وہ نہیں تھی جو نظامیؔ وجہیؔ، محمد قلیؔ غواصیؔ یا نصرتیؔ کے زمانے کی شعریات

تھی۔ تغیّر و تبدّل اور تازہ کاری کا جدلیاتی عمل مردہ زبانوں
میں تو رک جاتا ہے لیکن زندہ ادبی روایتوں کی اندرونی
حرکیت سے یہ برابر جاری رہتا ہے۔ اور یہ کہنے کی
ضرورت نہیں کہ اردو ایک زندہ زبان ہے۔" ع[1]

زندہ اور متحرک زبان اردو کی ثقافت اور شعریات کے بدلتے ہوئے رنگ و روپ کے اس گہرے شعور کی بنیاد پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے قدیم، وسطی اور جدید دور کے شعر و ادب کے جو تنقیدی مطالعے پیش کیے ہیں وہ یقیناً غیر معمولی ہیں۔ نارنگ صاحب کی تنقید نگاری کے امتیازات یوں تو کئی ہیں لیکن خاص طور پر انہوں نے اسلوبیات سے اپنی دلچسپی کی بنا پر سوسیئر اور دریدا کے لسانی تصورات کے حوالے سے میر انیسؔ اور اقبالؔ جیسے عظیم شعراء کے جو اسلوبیاتی مطالعے پیش کئے ہیں وہ اردو تنقید کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہی سب سے پہلے اردو دانشوروں کو شعر و ادب کی قدر سنجی کے لئے تھیوری سازی

ع[1]

کی جانب متوجہ کیا اور اپنی تاریخ ساز تصنیف "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" میں مشرقی نظریاتِ شعر سے بحث کرتے ہوئے جدید ترین مغربی تھیوریز سے بھی اردو دنیا کو متعارف کروایا۔ واقعہ یہ ہے کہ نارنگ کی اس تصنیف کے ذریعے ہی اردو قارئین کو ساختیات، پس ساختیات، ردِ تشکیل، تانیثیت اور قاری اساسِ تنقید CONSTRUCTION, DECONSTRUCTION, STRUCTURALISM, FEMINISM, READER, RESPONSE CRITICISM. وغیرہ تھیوریز (THEORIES) کو سمجھنے کا موقعہ اور قابلِ کار تھیوریز کے حق میں رائے زنی کی ہے ان کی اس صفت کے حوالے سے پروفیسر آل احمد سرور یوں رقمطراز ہیں:

> "وہ عہدِ حاضر کے ان چند فن شناس اور باریک بین نقادوں میں شامل ہیں جنہوں نے فن کی ماہیت تفاعل اور مقصدیت کے حوالہ سے جدید، صحیح اور متوازن ادبی نظریات کی وکالت کی ہے۔" ؎۱

پروفیسر گوپی چند نارنگ عصرِ حاضر کے ناقدین میں ایک منفرد اہمیت

؎۱ دیدہ ور نقاد: گوپی چند نارنگ (ترتیب و تزئین) ڈاکٹر شہزاد انجم ص ۱۰۹

کے حامل ہیں۔ نارنگ صاحب نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر لسانیات بھی ہیں اور یہ انکی شخصیت کی وہ خوبی ہے جو انہیں دیگر ناقدین سے ممیّز کرتی ہے۔ پروفیسر نارنگ تنقید کے بارے میں ایک اہم زاویۂ نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ تنقید پر اپنا نقطۂ خیال یوں پیش کرتے ہیں۔

"تنقید ادب میں سانس لینے کی طرح ناگزیر ہے۔ ادب کا کوئی تصوّر تنقید کے بغیر مکمل نہیں۔ تنقید ادب کی حریف نہیں ہے۔ ادب کی حلیف ہے۔ تنقید کا کام ادب شناسی، قدر شناسی اور افہام و تفہیم ہے۔"[۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی بیشتر تصنیفات میں تنقید کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور تنقید کی جدید ترین جہات پر اظہار خیال کیا ہے۔ نارنگ کی وسیع نظری نے ادب کا ایک نیا موقف اُجاگر کیا۔ انہوں نے عہدِ حاضر میں اردو تنقید کے نئے خیالات میں جدّت بھر دی اور اس میں گہرائی و گیرائی اور وسعت و کشادگی پیدا کر کے اس کو علمی آبرو و ودیعت کیا۔ ان کی متعددِ تنقیدی تصانیف موضوع اور معنویت کے اعتبار سے اپنا منفرد اور

[۱] دیدہ ور نقاد: گوپی چند نارنگ (مرتبہ) ڈاکٹر شہزاد انجم ص ۸۴۷

مکمل وجود رکھتی ہیں۔ مثلاً قاری اساسِ تنقید کو اگر لے لیں۔ نارنگ کی یہ کتاب قاری کو جدید سے جدید ترین دنیا سے آگاہ کرتی ہے۔ اس دنیا کی مکمل سیر کرداتی ہے اور وہ ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے جلد از جلد آگاہ ہو جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح "ادبی تنقید اور اسلوبیات" بھی اپنے موضوع کی نوعیت سے نارنگ کا ایک لافانی کارنامہ ہے۔ "ادبی تنقید اور اسلوبیات" کی اہمیت اور انفرادیت کا اندازہ نارنگ کے اس جملے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ:

> "اس سے کس کو انکار ہوگا کہ ادب کی پہچان اسلوب کے بغیر ممکن نہیں۔" ع[1]

دراصل اردو میں یوں تو اسلوبیات اور اسلوبیاتی تنقید کی ترویج و ترقی میں پروفیسر مسعود حسین خان اور پروفیسر مغنی تبسم سے لے کر مرزا خلیل بیگ تک نے اہم کردار ادا کئے ہیں لیکن اسلوبیات اور اسلوبیاتی تنقید کو مطالعۂ ادب کے ایک مستقل اور محترم دبستان کے طور پر قائم کرنے میں سب سے اہم کارنامہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجام دیا۔

ع[1] ادبی تنقید اور اسلوبیات۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۲۴

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی لسانیات سے ایک خصوصی دلچسپی رہی ہے۔
اسی بنیاد پر انہوں نے اسلوبیات میر (   ) لکھ کر گویا اسلوبیاتی
تنقید کی راہ ہموار کر دی۔ پروفیسر نارنگ نے اسلوبیات میر میں یہ ثابت کر دیا
کہ شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر میں لسانیات یا اسلوبیات کی مدد کے بغیر
فن پارہ یا فنکار کے تخلیقی مضمرات کی بازیافت مشکل ہے۔ ادبی تنقید میں
لسانیات و اسلوبیات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے پروفیسر حامدی
کاشمیری نے لکھا ہے۔

"ادبی تنقید کے جدید نظریات کا خواہ وہ ساختیات
ہو یا پس ساختیات یا نظریہ ردِ تشکیل۔ لسانیات و
اسلوبیات سے کسی نہ کسی حد تک رشتہ ضرور استوار
ہے۔ اسلوبیات جس کی بنیاد لسانیات پر قائم
ہے ان نظریات و تصوّرات سے گہرا علاقہ رکھتی
ہے۔ ان نظریات کو سمجھنے کے لیے اسلوبیات کا
سمجھنا ضروری ہے۔[1]

---

[1] تجربہ اور معنی۔ پروفیسر حامدی کاشمیری ص ۱۴۹

اسی طرح مشہور ماہر لسانیات اور اسلوبیاتی نقاد پروفیسر مرزا خلیل بیگ نے لکھا ہے۔

"ایک ادیب یا شاعر جب زبان کو ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تو وہ اس میں طرح طرح کے تصرفات سے کام لیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ اس میں کانٹ چھانٹ اور توڑ پھوڑ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس طرح وہ لسانی ضابطوں اور قاعدوں نیز زبان کے مروجہ اصولوں (NORMS) سے انحراف کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ نئے نئے لسانی سانچے تشکیل دیتا ہے۔ نئی نئی تراکیب اختراع کرتا ہے اور نت نئے تلازمات و انسلاکات وضع کرتا ہے۔۔۔ ان لسانی تصرفات و اختراعات سے وہ اپنی زبان خود تخلیق کرتا ہے اور اس کے وسیلے سے وہ اپنا جداگانہ اسلوب بھی تشکیل دیتا ہے۔ اسلوب کی اسی انفرادیت کے باعث ہم کسی ادیب یا شاعر کی پہچان قائم کرتے ہیں اور

اسے دوسرے ادیب یا شاعر سے ممیز کرتے ہیں ۔[۱]

تفہیم شعر کے لیے شعر کی لسانی ساخت پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے پروفیسر حامدی کاشمیری نے یہاں تک کہا ہے کہ

"جب تک شعر کی لسانی ساخت پر توجہ مرکوز کرکے اس میں لفظوں کے تلازمات سے تشکیل پانے والے فرضی تجربے جو اس کی تخلیقیت کا منبع بھی ہے اور تجسیم بھی، کی بازیافت نہ کی جائے اس وقت اس کی ہر نوع کی تعبیر و تشریح، خواہ وہ کتنی ہی عالمانہ کیوں نہ ہو دور از کار اور عائد کردہ ہوگی۔

تفہیم ادب کے باب میں اسلوبیات کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید نے پروفیسر مرزا خلیل بیگ کی تصنیف "تنقید اور اسلوبیاتی تنقید" سے متعلق اپنے مفصل تجزیاتی مقالے میں لکھا ہے۔

"کسی بھی ترقی یافتہ زبان میں جیسی کہ اردو ہے۔ "اسلوب" کی حیثیت اس سکہ رائج الوقت کی ہوتی ہے جس کے

۱۔ تنقید اور اسلوبیاتی تنقید ۔۔ مرزا خلیل بیگ ص ۴۳

ایک رُخ پر لسانیات کے علمی مضمرات ہوتے ہیں اور دوسرے
رُخ پر ادب کی فنی و جمالیاتی اقدار۔ اِسی لیے اسلوب ہی
وہ ساتواں در ہے جس سے کسی بھی ادیب یا ادبی تخلیق
کے انفراد و امتیاز کے نعت خواں میں داخل ہوا جا سکتا
ہے۔" [۱]

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج اردو میں اسلوبیات کے حوالے سے تنقید ایک منفرد دبستان کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر کے ضمن میں اسلوبیات کے کردار کے حوالے سے "اسلوبیاتی تنقید کی اہمیت اور معنویت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں مرزا خلیل بیگ نے پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر گیان چند جین، سہیل بخاری، مشفق خواجہ اور حامدی کاشمیری کے کارناموں کے حوالے سے "اسلوبیاتی تنقید" کے معنی و مفہوم اور غرض و غائیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"اسلوبیاتی تنقید ایک سائنسی نظریہ تنقید ہے جو مزاجاً

---

[۱] تجربہ اور معنی۔ پروفیسر حامدی کاشمیری ص ۱۳۹

توضیحی، معروضی اور غیر اقداری ہے۔ لہٰذا اس میں تعین قدر
کا کوئی جواز نہیں"۔

اور پھر ادبی تنقید اور اسلوبیاتی تنقید کے فرق کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ

"اسلوبیاتی تنقید، روایتی یا ادبی تنقید سے کئی اعتبار سے مختلف ہے اسلوبیاتی تنقید بہ حیثیت مجموعی لسانیات پر مبنی ہے یہ اپنے حربے نظری زاویے اور طریقۂ کار لسانیات سے لیتی ہے۔

حالانکہ مرزا خلیل بیگ ادب اور لسانیات کو دو الگ الگ شعبے مانتے ہوئے ادبی تنقید اور اسلوبیاتی تنقید کو بھی ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں لیکن اردو میں پروفیسر گوپی چند نارنگ ایک ایسے عجوبۂ روزگار دانشور ہیں جو بیک وقت ماہر لسانیات معتبر محقق اور منفرد نظریہ ساز نقاد کے طور پر اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کی ساری راہیں لسانیات سے ہی نکلتی ہیں لیکن ان کی تنقید شعر و ادب کے فنی در و بست اور جمالیاتی اقدار کو پہلو میں لے کر ہی

آگے بڑھتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے دوسرے ہم عصر تنقید نگاروں، پروفیسر محمد حسن، حامدی کاشمیری، شمس الرحمٰن فاروقی وہاب اشرفی، شمیم حنفی، اور قاضی افضال حسین، وغیرہ سے منفرد ہی نہیں ممتاز بھی نظر آتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ لسانیات کے غیر معمولی شعور اور آگہی کی بنا پر ہی اپنی تنقیدات میں وقار اور معیار پیدا کرتے ہیں۔ اسی لیے پروفیسر نارنگ، واضح طور پر یہ مانتے ہیں کہ

> "جس طرح تنقید۔ فلسفہ، نفسیات، تاریخ اور عمرانیات سے مدد لیتی ہے اسی طرح اسلوبیات سے بھی مدد لے سکتی ہے۔ کیونکہ تنقید کی تجزیاتی بنیادیں تو اسلوبیات ہی کی مدد سے صحیح طور پر سامنے آسکتی ہیں۔"

چنانچہ لسانیات کے حوالے سے ہی پروفیسر نارنگ اپنی تنقید کو اسلوبیاتی تنقید کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ لسانیات کی دوسری شاخوں مثلاً اسلوبیات اور ساختیات وغیرہ سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں انہوں نے لسانیاتی علم و آگہی اور تجزیاتی شعور سے کام لے کر اسلوبیاتی

کے بنیاد گذاروں نے مشرقی زبانوں کے اصول و ضوابط سے بھی اثرات قبول کئے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر نارنگ نے خاص طور پر مشہور مغربی ماہر لسانیات سوسیئر (F.D. SASSURE) کے زبان و ادب سے متعلق تصورات پر سنسکرت کے لسانی اور شعری مباحث کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

دراصل پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری میں اسلوبیات کے عمل دخل اور کردار پر غور کرنے کے لیے لسانیات کے ساتھ اسلوبیات اور ساختیات کے رشتوں پر بھی غور کرنا ہوگا۔ چونکہ پروفیسر نارنگ ایک مابعد جدید نقاد ہیں اور مابعد جدید تصور ادب کا گہرا تعلق ساختیات (STRUCTURAL-ISM) سے ہے۔ اس لیے لسانیات، اسلوبیات اور ساختیات جیسی اصطلاحوں کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تاکہ پروفیسر نارنگ کے اسلوبیاتی مطالعات کی اہمیت کو سامنے لایا جاسکے۔

لسانیات (LINGUISTICS) زبان کے سائنسی مطالعے کا علم ہے دوسرے لفظوں میں لسانیات وہ علم ہے جس میں زبان کی ماہیت کا سائنسی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ لسانیات میں زبان کا مطالعہ

چار عنوانات سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ صوتیات ۔ PHONOLOGY

۲۔ لفظیات ۔ MORPHOLOGY

۳۔ نحویات ۔ SYNTAX

۴۔ معنیات ۔ SEMANTICS

دراصل زبان انہیں چار عناصر سے مل کر اپنا وجود قائم کرتی ہے اپنی شکل اور پہچان بناتی ہے۔ شعر و ادب کے لسانیاتی تجزیوں میں اکثر ان میں سے الگ الگ عناصر کے حوالے سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ لیکن ادبی و تخلیقی اظہار میں ان میں سے ہر ایک عنصر کا بحیثیت مجموعی خیال رکھا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی ادب پارے کا جائزہ لیتے ہوئے زبان کے اس کُلی تصور کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے جس میں یہ چاروں چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ لفظ معنی ہے اور معنی لفظ ہے اور معنی کی اکائی کلمہ ہے اور کلمہ لفظ یا لفظوں کا مجموعہ ہے جو ایک معنی دیتا ہے اور خود لفظ آوازوں کا مجموعہ ہے یعنی معانی کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح اسلوبیات کیا ہے؟ اس کے بارے میں خود گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے۔

"اسلوب کا بنیادی تصور اسلوب ہے۔ اسلوب (STYLE) کوئی نیا لفظ نہیں مغربی تنقید میں یہ لفظ صدیوں سے رائج ہے اردو میں اسلوب کا تصور بنتا گیا ہے۔ تاہم زبان و بیان، انداز، اندازِ بیان، طرزِ بیان، طرزِ تحریر، لہجہ، رنگ، رنگ سخن، وغیرہ اصطلاحیں اسلوب یا اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کی جاتی رہی ہیں"۔ ع۱

آگے مزید لکھتے ہیں۔

"جدید لسانیات نے اسلوبیات کا جو نیا تصور دیا ہے... اس کی رُو سے اسلوب کی حیثیت ادبی اظہار میں اضافی نہیں بلکہ "اصلی" ہے۔ یعنی اسلوب لازم ہے یا ادبی اظہار کا ناگزیر حصہ ہے یا اس تخلیقی عمل کا ناگزیر حصہ ہے جس کے ذریعے زبان ادبی اظہار کا درجہ حاصل کرتی ہے.... اسلوبیات وضاحتی لسانیات (DESCRIPTIVE LINGUISTICS) کی وہ شاخ ہے جو ادبی اظہار

ع۱ تنقید اور اسلوبیات۔ گوپی چند نارنگ۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۱۹۸۹ ص۱۴

کی ماہیت، عوامل اور خصائص سے بحث کرتی ہے اور
لسانیات چونکہ سماجی سائینس ہے اس لیے اسلوبیات
اسلوب کے مسئلے سے تاثراتی طور پر نہیں، بلکہ معروضی طور
پر بحث کرتی ہے، نسبتاً قطعیت کے ساتھ اس کا تجزیہ
کرتی ہے اور مدلل صحت کے ساتھ نتائج پیش کرتی
ہے"۔

اسلوب اور اسلوبیات کی اہمیت اور معنویت کی وضاحت کرنے کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شعر و ادب میں اسلوبیات کے عمل دخل کی جہتوں کو کھولتے ہوئے شعر و ادب میں اسلوبیات کے دائرہ کار اور امکانات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

" اسلوبیات کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کوئی خیال، تصور، جذبہ یا احساس، زبان میں کئی طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ زبان میں اس نوع کی یعنی پیرایۂ بیان کے اختیار کی مکمل آزادی ہے۔ شاعر یا مصنف قدم قدم پر پیرایۂ بیان کی آزادی کا استعمال کرتا ہے۔ پیرایۂ بیان کی آزادی

---

۱ ادبی تنقید اور اسلوبیات۔ گوپی چند نارنگ ص ۱۵

کا استعمال شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری بھی اور اس
میں ذوق، مزاج، ذاتی پسند و ناپسند، صنف یا ہئیت
کے تقاضوں نیز قاری کی نوعیت کے تصور کو بھی دخل
ہوسکتا ہے یعنی تخلیقی اظہار کے جملہ ممکنہ امکانات جو
وجود میں آچکے ہیں اور وہ جو وقوع پذیر ہو سکتے ہیں
ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا دراصل اسلوب
ہے"۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے اسلوب اور اسلوبیات کے نظریاتی جہات اور اطلاقی امکانات کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ سے زیادہ معتبر اور مستند خیالات کا اظہار عصر حاضر کے کسی دوسرے نقاد نے اس طرح شرح و بسط کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ نے شعر و ادب کے تنقیدی جائزے کے حوالے سے روایتی اقدار و معائر کے ساتھ ساتھ جدید ترین ادبی نظریات و تصورات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ خیالات صرف قارئین کے لئے ہی نہیں تخلیق کاروں کے لیے بھی رہنما اصول کا حکم رکھتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر سے متعلق انتہائی گہرے اور تہہ دار خیالات کا اظہار بھی اس قدر سنجیدہ لیکن شگفتہ اور فلسفیانہ لیکن کھلے ڈلے اسلوب میں کرتے ہیں کہ بڑی سے بڑی پیچیدہ اور تہہ دار بات بھی قاری کے دل و دماغ میں اتر جاتی ہے۔ پروفیسر نارنگ کے اس دلچسپ اور قائل کرنے والے "اسلوب" کا اندازہ اسلوبیات کے حوالے سے ہی ان کے درج ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ "ادبی اسلوبیات تجزیاتی طریق کار کے استعمال سے تخلیقی اظہار کے پیرایوں کی نوعیت کا تعین کر کے ان کی درجہ بندی کرتی ہے وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ فنکار نے ممکنہ تمام لسانی امکانات میں سے اپنے طرز بیان کا انتخاب کس طرح کیا اور اس سے جو اسلوب خلق ہوا، اس کے امتیازات یا خصائص کیا ہیں، یعنی وہ کون سی لسانی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے کسی پیرایۂ بیان کی الگ سے شناخت ممکن ہے یا لسانی اظہار

کا جو عمومی فطری انداز (NORM) ہے اس سے کسی مصنف یا شاعر کا کوئی پیرایۂ بیان کتنا مختلف ہے یا کسی مخصوص طرزِ اظہار میں کون کون سے لسانی خصائص پس منظر میں چلے گئے ہیں اور کون کون سے پیش منظر میں آ گئے ہیں۔ اسلوبیات میں یہ عمل (FORE - GROUNDING) کہلاتا ہے۔

۲۔ "اسلوبیاتی تجزئے میں ان لسانی امتیازات کو نشان زد کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے کسی فن پارے، منصف، شاعر، ہیئت، صنف یا عہد کی شناخت ممکن ہو۔ یہ امتیازات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ (۱) صوتیاتی (آوازوں کے نظام سے جو امتیازات قائم ہوتے ہیں (یعنی ردیف و قوافی کی خصوصیات یا معکوسیت، ہکاریت یا غنیت کے امتیازات یا مصمتوں اور مصوتوں کا تناسب وغیرہ) (۲) لفظیاتی (خاص نوع کے الفاظ کا اضافی تواتر، اسما اسمائے صفت، افعال وغیرہ کا تواتر اور تناسب،

تراکیب وغیرہ) (۳) نحویاتی (کلمے کی اقسام میں سے
کسی کا خصوصی استعمال، کلمے میں لفظوں کا دروبست
وغیرہ (۴) بدیعی (RHETORICAL) بدیع وبیان
کی امتیازی شکلیں، تشبیہہ واستعارہ کنایہ، تمثیل، علامت
امیجری وغیرہ (۵) عروضی امتیازات (اوزان وبحور،
زحافات وغیرہ کا خصوصی استعمال اور امتیازات۔"

اگران اقتباسات پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ فن پارہ، شاعر، مصنف، صنف، ہیئت، زبان، انداز بیان، لب ولہجہ، رنگ سخن اور معنی و مفہوم کے حوالے سے ایسی "تنقیدی بصیرت" اور ایسے دانشورانہ افکار و خیالات، ایسے سہل اور شگفتہ اسلوب میں بیان کرنے کا فن کم از کم پروفیسر نارنگ کے بغیر کسی بھی دوسرے ہم عصر نقاد کے یہاں نظر نہیں آتا چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری اسلوبیات کے حوالے سے بھی منفرد و ممتاز ہے۔ اسلوبیات کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی بے مثال تنقید نگاری کی لازوال مثالیں میر تقی میر،

۱۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات۔ گوپی چند نارنگ۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۹ء

غالبؔ، اقبالؔ اور انیسؔ جیسے شاعروں اور منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اور انتظار حسین سے متعلق ان کی تحریروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

(ج) گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

سماجی و ثقافتی التلازمات کے حوالے سے

کسی بھی زندہ اور متحرک زبان میں، جیسی کہ اردو زبان ہے شعر و ادب میں معاشرہ اور ثقافت کی تبدیلیوں کے زیر سایہ مختلف و متضاد نظریات و تصوّرات کا ظہور میں آنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں لیکن مقامی یا عالمی سطح پر نمایاں ہونے والے نظریاتی تغیّرات کے باوجود ہر زبان میں تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیاں اپنے معاشرتی اور ثقافتی حوالوں کے ساتھ ہی سامنے آتی ہیں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی ادیب اور شاعر خواہ جتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے اپنے معاشرہ اور ثقافت سے باہر رہ کر نہیں لکھ سکتا۔ جہاں تک پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کے سماجی اور ثقافتی التلازمات کا سوال ہے۔ ہر چند کہ وہ کبھی ترقی پسند نہیں رہے۔ اردو میں ۱۹۴۷ء کے آس پاس جدیدیت کے رجحان کے

فروغ کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی جدیدیت کی حمایت اور ترقی پسندی کی مخالفت کی۔ لیکن ان کی حمایت یا مخالفت میں شدت نہیں تھی۔ عصری حالات اور رجحانات کے تحت انہوں نے توازن اور تناسب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی لیے وہ ۱۹۸۰ء تک آتے آتے نہ صرف یہ کہ ادب کی سماجیات اور تہذیبیت (SOCIOLOGY & CULTUROLOGY OF LITERATURE) کی حمایت کی بلکہ اس بات کا بھی برملا اظہار کیا کہ جدیدیت کا رجحان ایک بھولا ہوا حافظہ ثابت ہو چکی ہے اور یہ کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنہوں نے اردو ادب کے سرمایہ میں قابل قدر اضافے کئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری ابتداء سے ہی سماجی اور ثقافتی انسلاکات کو اہمیت دیتی رہی ہے اور اس کی بازگشت ان کی ہر دور کی تنقید نگاری میں سنائی دیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ کے ڈاکٹریٹ کا موضوع ہی "اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ" تھا۔ بعد میں یہ مقالہ کم و بیش پچاس برسوں کے بعد تین کتابوں کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ تین کتابیں ہیں۔

۱۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

۲۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب

۳۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

ان تصنیفات کے عنوانات پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے سماجی و ثقافتی انسلاکات کی نشاندہی کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ویسے ادب کے حوالے سے معاشرت اور ثقافت کے بارے میں خود پروفیسر نارنگ کا نقطۂ نظر کیا ہے اس کا اندازہ ان کی تصنیف" اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب" کے دیباچے کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

" شعروادب میں آفاقیت اور مقامیت کی کشاکش بہت پرانی ہے۔ ادب کو متشکل کرنے میں بعض آفاقی اصول ضرور کارگر رہتے ہیں لیکن ادب کی تخصیص مقامی اصولوں ہی سے طے پاتی ہے۔ ہر زبان کے ادب کی جان اس کی شعریات ہے جو قائم ہوتی ہے ملکوں اور قوموں کے ذہن و مزاج اور ان کی تاریخ و تہذیب سے، جن کے سانچے میں ادب ڈھلتا ہے.... ہر ادب

پہچانا جاتا ہے اپنی تہذیبی نقش گری اور خاص اپنی لسانی اور شعریاتی تشکیل سے۔ غرض یہ کہ جس طرح فرانسیسی ادب کی تحسین و تفہیم کے لیے بنیادی پیمانہ فرانسیسی تہذیب و شعریات ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی ادب کی تحسین و تفہیم کے لیے بھی ہماری اپنی شعریات و تہذیب کا پیمانہ شرط ہے تاہم یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہندوستان ایک وسیع اور بوقلموں ملک ہے پورے یورپ کی طرح جس میں متعدد زبانیں اور متعدد لسانی وادبی کلچر اور شعریاتی سلسلے ہیں جو باہمدگر مربوط بھی ہیں اور مختلف بھی۔ دراوڑی زبانوں کی روایتیں یکسر وہ نہیں ہیں جو ہند آریائی زبانوں کی ہیں اور تو اور ہند آریائی زبانوں میں بھی بنگالی، گجراتی، مراٹھی، ہندی وغیرہ ہر چند کہ ہند اساس ہیں۔ اپنی اپنی تخصیص بھی رکھتی ہیں۔ تہذیبی رشتے براہِ راست اور سادہ نہیں ہوتے۔ نوعیت کے اعتبار سے تہذیبی رشتے خاصے

پیچیدہ اور جدلیاتی ہوتے ہیں اور ذہن و مزاج اور تاریخ و
عمرانیات میں گُھتے ہوتے ہیں۔

شعروادب کی جڑیں اپنے معاشرہ اپنی ثقافت میں کس حد تک گہرائی میں پیوست ہوتی ہیں اور شعروادب کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا کس قدر ضروری ہے اس بات کی وضاحت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مذکورہ بالا اقتباس میں بڑی خوبی سے کی ہے۔ بلکہ اس اقتباس پر سنجیدگی سے غور کریں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا تنقیدی زاویہ نظر سماجی و ثقافتی، ہر چند کہ اسکی نوعیت ترقی پسندوں کی طرح سیاسی نہیں بلکہ لسانی اور ادبی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ شعری و ادبی روایات اور اجتہادات کی جستجو اپنی زمین کی مٹی، معاشرہ اور تہذیب میں ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اردو زبان کے بارے میں انہوں نے برملا کہا ہے۔

" اردو ملی جلی ادبی اور تہذیبی روایتوں کے بطن سے
ابھری ہے اور اپنی نقش گری خود بھی کرتی ہے۔ اس ضمن
میں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ "اردو ایک ہند آریائی زبان

ہے"۔ ہندی و بنگالی و مراٹھی سے اس کا رشتہ اصلی و اساسی ہے اس کا ذہن و مزاج ہندوستانی ہے لیکن اس میں عربی و فارسی اثرات کا رنگ چوکھا ہے اس کی شعریات باقی تمام ہندوستانی زبانوں سے اس اعتبار سے الگ ہے کہ اس نے عربی فارسی اجزا کو ۔۔۔ سے ممزوج کر کے ایک نیا ہیولا خلق کیا ہے جس کی بدولت یہ نہ عربی فارسی کی کاربن کاپی ہے نہ سنسکرت کی۔ اردو نہ عربی کی طرح سامی خاندان سے ہے نہ فارسی کی طرح ایرانی خاندان سے، اردو لسانی ساخت و اساس کے اعتبار سے ہند آریائی ہے لیکن دو عظیم تہذیبوں کے درمیان ربط و ارتباط نے اسے ایسی امتیازی حیثیت عطا کی ہے جو برصغیر کی زبانوں میں کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں۔ اردو گویا زبانوں کی دنیا کا تاج محل ہے جو اپنے تہذیبی و جمالیاتی امتزاجی حسن و دلکشی اور طرحداری سے اپنی الگ انفرادیت اور امتیازی شناخت رکھتا ہے"۔ ؏۱

؏۱ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۲۰

دراصل پروفیسر گوپی چند نارنگ بنیادی طور پر ایک سیکولر اور محب وطن انسان اور دانشور ہیں جن کی پرورش گنگا جمنی تہذیب کی گود میں ہوئی۔ انہوں نے بلوچستان کے مقام " دُکی " سے لے کر دہلی تک۔ سماجی اور ثقافتی نشیب و فراز کا گہرائی سے مشاہدہ بھی کیا اور ان کے اثرات بھی قبول کئے۔ ادھر گزشتہ چند برسوں میں دوسروں کے علاوہ خود پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے حالات زندگی کے حوالے سے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ میں نے اپنے زیر نظر مقالے کے باب اول میں پروفیسر گوپی چند نارنگ ایک تعارف کے عنوان سے ان کے خاندانی حالات اور سفر زندگی کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے سیکولر ذہن اور اپنی زمین اور اپنی مشترکہ تہذیب سے ان کی وابستگی پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اردو چونکہ خود ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے اس لیے ہر چند کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے لیکن یہ اردو کی تہذیبی رنگارنگی ہی ہے کہ گوپی چند نارنگ۔ اردو کے رنگ میں ایسے رنگے کہ آج عالمی سطح پر اردو شعر و ادب کی محفلوں میں رنگ اُس وقت تک نہیں بھرتا جب تک کہ ان میں پروفیسر نارنگ شامل نہ ہوں۔ معاشرہ کے ہر مذہب و ملت

کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے ان کے ایسے گہرے مراسم ہیں کہ ہر شخص انہیں اپنے ہی خانوادے اور قبیلے کا فرد سمجھتا ہے اور یہ اردو زبان و ادب کا ہی اعجاز ہے کہ ان کی تنقید نگاری میں بھی اس مشترکہ تہذیب اور رنگارنگ سماجی ڈھانچے اور رسوم و رواج کے اثرات ان کی زبان اور افکار و خیالات کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے خود لکھا ہے۔

" اردو کے تہذیبی امتیاز و انفراد کے بھید بھرے سنگیت کو میں بچپن سے سنتا رہا ہوں۔ بلکہ یہ میری سائکی کا حصہ ہے۔ ہر چند کہ اردو میری مادری زبان نہیں اور میری ابتدائی پرورش بلوچستان میں غیر اردو ماحول میں ہوئی۔ شاید نفسیاتی و ذہنی کشش کا یہ بھی ایک سبب رہا ہو بہر حال جب میں نے ۱۹۵۲ء میں تاریخی دلی کالج میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا تو اس کا بھی کوئی داخلی سبب رہا ہوگا..... یہ وہ زمانہ تھا جب اردو بٹوارے کی سیاست کی بھینٹ چڑھائی جا رہی تھی..... ۱۹۵۲ء سے

۲۰۰۲ء (بلکہ اب تک) میرا ادبی سفر اگر کچھ نہیں تو نصف صدی کو تو محیط ہے۔ اسے دیوانگی ہی کہا جائے گا کہ میرے کام میں خواہ وہ زبان و لسانیات و اسلوبیات سے تعلق رکھتا ہو یا اساطیر و دیومالا سے، کتھا کہانی، فکشن افسانہ یا غزل و مثنوی سے یا ادبی تھیوری سے۔ میرؔ و غالبؔ و انیسؔ و اقبالؔ و نظیرؔ سے یا پریم چندؔ، منٹوؔ، بیدیؔ، کرشنؔ و فیضؔ و فراقؔ سے۔ جڑوں کی کھوج یا تہذیبی رشتوں کی بازیافت کہیں نمایاں کہیں تہہ نشیں میرے ہم رکاب رہی ہے اور میری ترغیب ذہنی کیلئے سمت نما کا کام کرتی رہی ہے۔ اس میں کتنا کامیاب ہوا کتنا ناکام، 'شاید جہاں معاملہ عشق کا ہو' کامیابی و ناکامی پیمانہ نہیں ہوا کرتی۔"

مذکورہ بالا اقتباسات کے نشان زد جملوں کو ذہن میں رکھ کر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تحریروں کا از سر نو جائزہ لیں۔ اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی تنقید نگاری میں سماجی و ثقافتی انسلاکات ہر جگہ نمایاں نظر آئینگے۔ یادداشت کے

طور پر ان کی مختلف تحریروں سے یہ اقتباسات دیکھئے۔

۱۔ "..... اردو غزل نے احساس جمال کی ہندی اور ایرانی دونوں راہوں پر چل کر دیکھا اور ان میں سے کوئی بھی راہ اسے راس نہ آئی۔ ہندی روش کو اس لیے ترک کر دینا پڑا کہ وہ ہندایرانی معاشرت کے پردہ اور ربط وضبط کے قاعدوں کے خلاف تھی اور ایرانی، فارسی روش اس لیے قابل قبول نہ ٹھہری کہ وہ بڑی حد تک غیر فطری تھی اور ہندوستانی ذہن کے جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل نہ تھی چنانچہ اردو غزل نے اعتدال کی راہ نکالی اور ایرانی و ہندی تصورات کے امتزاج سے ایک نیا تصور قائم کیا یہ خالص ہندی ہے نہ ایرانی بلکہ اس کی سرشت دونوں کے خمیر سے ہوئی ہے۔ اس کا منصب ایک ایسے سماج کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے جس میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی۔ مقامی جمالیاتی احساس، حسن امرد کا قائل نہیں اس لیے

حسن و جمال کے ہند ایرانی تصور کے تحت اردو غزل میں محبوب کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے اس کا تعلق طبقہ نسواں سے ہے لیکن چونکہ حسن کی جسمانیت، لوازمات اور اوصاف کا کھلم کھلا بیان ہند، ایران معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ذکر میں مذکر افعال کا التزام برقرار رہا تاکہ جنس کی تخصیص پر پردہ پڑا رہے۔ فارسی میں فعل کی تذکیر و تانیث ہے ہی نہیں۔ چنانچہ اردو میں مذکر افعال کا استعمال اس وجہ سے بھی جاری رہا۔ غزل کا مزاج یوں بھی ایمائی اور رمزیہ ہے جو واقعیت کی اجازت کم ہی دیتا ہے۔ نتیجتاً مذکر نحوی ڈھانچہ اردو غزل کو راس آگیا اور رفتہ رفتہ یہ التزام ہمیشہ کے لیے قائم ہوگیا۔“[۱]

۲۔ ”..... سنسکرت شعریات پر سب سے زیادہ کام ہمالیہ کی ان بلندیوں اور وادیوں میں ہوا جو کشمیر میں ہیں ۔

۱۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب۔ پروفیسر نارنگ ص ۱۷۲-۱۷۱

آنند وردھن، ابھنوگپت، ممٹ۔ سب کشمیری شیو برہمن تھے۔ بودھی مفکرین کی تعداد بھی کم نہیں۔ ناگارجن اور رِدناگا بودھ تھے اور مشرقی ہمالیائی علاقے ناگا دلیس کے رہنے والے تھے۔ نیز بھامہ اور دنڈن بھی بودھ یا جین تھے۔ اس سے یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ سنسکرت شعریات پر اگرچہ زیادہ کام شیو برہمنوں نے کیا لیکن سنسکرت شعریات تمام و کمال برہمنوں کی مرہونِ منت نہیں اس میں دو دھارے واضح طور پر ملتے ہیں یعنی برہمن دھارا اور غیر برہمن دھارا۔ یا برہما اور آتما کو ماننے والوں کا دھارا اور نہ ماننے والوں کا دھارا۔" ع۱

۳۔ "علمائے عرب علوم کی تقسیم دو طرح سے کرتے رہے ہیں۔ پہلی قسم میں علم دین، علم الاخلاق، علم النحو، ادب اور تاریخ کو شامل کیا جاتا تھا اور دوسری قسم میں

ع۱ ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ پروفیسر نارنگ ص ۲۴۱-۴۲

علوم فلسفہ، علوم طبیعات وکیمیا اور علوم طب داخل تھے اگرچہ دوسری قسم کے علوم نے زیادہ تر بیرونی ممالک کے اثرات سے نشوونما پائی اور انہیں عرب میں کبھی قبول عام کی سند عطا نہیں ہوئی۔ لیکن جو عربی علوم کہلاتے ہیں وہ بھی خالص ملکی پیداوار نہیں ہیں اور ان کا ارتقا عالم اسلام کے ان حصوں میں ہوا جہاں عربوں کو دوسری قوموں سے سابقہ..... اس کی بدولت انہیں ان چیزوں پر جو فطرتِ انسانی سے زیادہ قریب ہیں مثلاً زبان، شاعری، قانون، مذہب پر غور و فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عربی زبان کے لفظوں اور ترکیبوں کی کثرت اور قوت اشتقاق و انحراف پر عربوں کو خاص طور پر ناز تھا۔ عربی جیسی فصیح، پرمعنی اور مشکل زبان کے شامیوں اور ایرانیوں میں نفوذ کر جانے سے بہت سے مسائل پیدا ہوگئے اول تو قرآن (پاک) کے مطالعے، تجوید اور تفسیر

کے لیے زبان پر عبور ضروری تھا۔ دوسرے زبان دان کے عام اصولوں سے بحث بھی کی گئی۔ باوجود بیرونی اثرات کے، علم اللسان کا موضوع بہر حال عربی زبان تھی اور یہ "دقیق النظر" اور محنتی عربوں کے ذہن کی مہتم بالشان آفرینش ہے۔ جس پر وہ ناز کر سکتے ہیں۔" ع۱

۴۔ "کون نہیں جانتا کہ اردو نے ہند آریائی کا دودھ پیا ہے اور اسی دھرتی پر پلی بڑھی ہے ..... جب نئی تاریخیں حقیقتیں ابھرتی ہیں تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔ اردو ایسی ہی ایک سچائی ہے۔ لسانی، سماجی اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے سابقے اور اختلاط و ارتباط سے وجود میں آئی اس وقت اس کا کوئی

ع۱۔ ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔
پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۳۸۸

نام نہیں تھا۔ کوئی بھی سچائی جب جنم لیتی ہے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سچائیوں کو نام تو اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہوتی ہیں۔ پراکرتوں کی دھرتی سے جب نیا اکھوا پھوٹا اور اس میں عربی، فارسی، ترکی اثرات کا پیوند لگا تو اس کا کوئی بھی نام نہیں تھا "ہند" یعنی ہندوستان کی ہر چیز "ہندی" تھی۔ فارسی یائے نسبتی کے ساتھ، اس طرح ہر زبان ہندی تھی"۔ ۱؎

●

۱؎ اردو ہماری زبان۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔
مشمولہ دیدہ ور نقاد۔ گوپی چند نارنگ۔ مرتبہ شہزاد انجم صہ ۲۵۹

• گوپی چند نارنگ کی فن شناسی

(اصناف، مثنوی، غزل، مرثیہ، افسانہ وغیرہ کے حوالے سے)

پورا ناقد وہ ہوتا ہے جو اپنی زبان معاشرہ اور ثقافت کے حوالے سے فن شناسی اور فن کار شناسی کے فریضے کو تمام تر فنی، لسانی اور جمالیاتی روایات و اجتہادات و اقدار اور تقاضوں کو گرفت میں لے کر انجام تک پہنچانے کا حوصلہ اور سلیقہ رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے پروفیسر گوپی چند نارنگ یقیناً ایک بڑے اور مکمل تنقید نگار ہیں۔

اردو زبان و ادب کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ایسا زاویہ ہوگا جس پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اظہار خیال نہ کیا ہو۔ بلکہ وقتاً فوقتاً نہ کرتے رہے ہوں۔ چنانچہ فن شناسی کے باب میں بھی ان کے یہاں تنقیدی افکار و خیالات مختلف و متنوع ارتقائی و ارتقائی صورتوں میں ملتی ہیں۔ ان سب کو ایک جگہ ترتیب دینا ایک مستقل منصوبہ بندی کا تقاضہ کرتا ہے لیکن یہاں پروفیسر نارنگ کی فن شناسی کا جائزہ ان کی تنقید نگاری کے محض ایک پہلو ایک شق کے طور پر لیا جا رہا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ شرح و بسط کے

بجائے اختصار سے ہی کام لینے کی گنجائش نکل پائے گی ۔ لہذا یہاں اردو شاعری کی چند ایک نمائندہ اصناف مثلاً مثنوی، غزل، مرثیہ اور افسانہ وغیرہ سے متعلق ان کی تحریروں کے منتخب اقتباسات کی پیش کش پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔ تاکہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی " فن شناسی " کے اسلوب اور معیار کا اندازہ لگایا جا سکے۔

مثنوی اور نارنگ کی تنقید نگاری

مثنوی ۔ نظم کی قدیم قسموں میں سے ایک ہے۔ نظم کی دوسری قدیم قسمیں مرثیہ اور قصیدہ ہیں۔ مثنوی بیانیہ شاعری ہے جس میں عام طور پر عشقیہ قصے بیان کئے جاتے ہیں لیکن مثنوی میں فکر انگیز اور نصیحت آموز باتیں بھی بیان کی جا سکتی ہیں ۔ اس کی مثال مثنوی مولانا روم ہے ۔

مثنوی عربی لفظ ہے جو " مثنیٰ " سے نکلا ہے ۔ عربی میں لفظ مثنیٰ کے معنی دو دو کے ہیں ۔ اس کے علاوہ مثنیٰ کے معنی دو دو کی ہوئی چیز بھی ہے ۔ اس کے علاوہ مثنیٰ کے معنی جوڑ ۔ یا جوڑا بھی ہے ۔ لہذا نظم کی وہ قسم جس میں کوئی بات ربط اور تسلسل کے ساتھ بیان کی جاتی ہے اس میں ہر شعر کا قافیہ الگ ہوتا ہے لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے

ہیں۔ چونکہ مثنوی کے ہر شعر میں قافیے جوڑوں کی شکل میں استعمال ہوتے ہیں اس لیے نظم کی اس قسم کو "مثنوی" کا نام دیا گیا ہے یعنی جس نظم میں بات یا قصہ تو ایک ہو لیکن اس کا بیان شاعری میں تسلسل کے ساتھ اس طرح کیا گیا ہو کہ ہر شعر میں قافیے جوڑوں کی شکل میں استعمال ہو۔

مثنوی کا نام عربی سے لیا گیا لیکن غزل کی طرح مثنوی بھی فارسی مشاعروں کی ایجاد ہے۔ فارسی شاعروں نے مثنوی میں عشقیہ قصوں کے علاوہ مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی باتیں بھی بیان کی ہیں۔

مثنوی کو کئی دانشوروں نے سب سے اہم اور کارآمد صنف شاعری قرار دیا ہے اسی طرح مولانا شبلی نے کہا ہے کہ "یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے"۔

اردو میں مثنوی کا آغاز بھی دوسری اصناف کی طرح دکن میں ہی ہوا۔ دکن میں ابتدا میں سب سے زیادہ مثنویاں ہی لکھی گئیں۔ اردو کی پہلی مثنوی جواب تک دریافت ہوئی ہے۔ وہ مثنوی "کدم راو پدم راو" ہے جس کے مصنف فخر الدین نظامی ہیں۔ اس مثنوی کا اصل نام کیا تھا یہ معلوم نہیں لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی کے دو مرکزی کرداروں کے نام پر اسے "مثنوی کدم راو

پدم راو کا نام دیا ہے" اور لکھا ہے کہ اس کا سنہ تصنیف معلوم نہیں لیکن یہ نویں دسویں صدی ہجری یعنی تیرہویں چودھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے پندرہویں صدی عیسوی میں بعض مثنویاں ملتی ہیں لیکن ان کی ہیئت مثنوی سے زیادہ عام نظم کی ہے مثلاً برہان الدین جانم کی وصیت الہادی اور بشارت الہادی، شیخ غلام محمد دادل کی "چہار شہادت، کشف الوزار، کشف الوجود اور نادی نامہ اور فیروز کی "پرت نامہ" وغیرہ مشہور ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں جو اہم مشہور مثنویاں لکھی گئیں ان میں سے چند ایک اس طرح ہیں۔

۱۔ فتح نامہ نظام شاہ ــ مصنف حسن شوقی
۲۔ قطب مشتری ــ وجہی
۳۔ سیف الملوک و بدیع الجمال ــ غواصی
۴۔ گلشن عشق ــ محمد نصرت نصرتی
۵۔ سید میراں ہاشمی کی معراج نامہ۔ یوسف زلیخا وغیرہ کئی مثنویاں مشہور ہیں۔

شمالی ہند میں مثنوی کے آغاز و ارتقا سے بحث کرتے ہوئے کچھ لوگوں نے بابا فرید گنج شکر اور حضرت امیر خسرو سے منسوب بعض اشعار کو شمالی ہند

یں مثنوی کے اولین نمونے قرار دیا ہے لیکن ان اشعار کی زبان اتنی صاف ہے کہ انہیں بابا فرید اور امیر خسرو کی تصنیف ماننا مشکل ہے۔ لہٰذا افضل متوفی ۱۶۲۵ء کی بکٹ کہانی کو شمالی ہند کی پہلی مستند مثنوی مانا جاتا ہے۔ بکٹ کہانی ایک دلچسپ عشقیہ داستان ہے جس یں ہندی کی ایک مشہور صنف شاعری "بارہ ماسہ" کی طرح ایک عورت کی اپنے شوہر کی جدائی یں ہر مہینہ اپنے دل پر گزرنے والی کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے۔

شمالی ہند یں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں جن یں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ مثنوی فقہ ہندی۔ مصنف شیخ عبداللہ این (۱۶۴۴ -) اس مثنوی یں فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ درد نامہ ۔ مصنف محبوب عالم عرف شیخ جیون ۔ یہ مثنوی پونے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اس یں آنحضرتؐ کی ولادت سے لے کر وصال تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ شیخ جیون کی تین اور مثنویاں بھی مشہور ہیں۔ جن کے نام ہیں۔ (۱) محشر نامہ (۲) خواب نامہ پیغمبرؐ اور دھیر نامہ بی بی فاطمہؓ۔

۳۔ ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر بادشاہ غازی۔ اس کے مصنف مشہور

مزاح نگار اور ہجو نگار شاعر جعفر زٹلی ـــ اس مثنوی میں بادشاہ اورنگ زیب کی فتوحات خصوصاً فتح دکن کا ذکر کیا گیا ہے۔ جعفر زٹلی نے اور بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں۔

۴۔ مثنوی تولد نامہ بی بی فاطمہؓ۔ مصنف اسمٰعیل امروہوی۔

۵۔ شمالی ہند کے مشہور شاعر فائز دہلوی نے مختلف موضوعات پر ۱۶ مثنویاں لکھیں زیادہ تر مثنویاں عورتوں مثلاً جوگن، مالن، تبنولن وغیرہ پر ہیں لیکن چند ایک اخلاقی اور مذہبی مثنویاں بھی لکھی ہیں ہولی کے تہوار پر بھی ایک مثنوی ہے، ان کی مثنویوں سے اس دور کے سماجی و ثقافتی حالات و اقدار کا اندازہ ہوتا ہے۔

۶۔ شاہ حاتم نے پانچ مثنویاں لکھی ہیں۔ (۱) مثنوی سراپا (۲) ساقی نامہ (۳) وصف قہوہ (۴) وصف تمباکو و حقہ۔ (۵) مثنوی بہاریہ مسمیٰ بہ بزم عشرت

۷۔ گوہر جوہری۔ مصنف شاہ آیت اللہ جوہری (م۔ ۱۷۴۸ء) شمالی ہند کی مشہور مثنوی ہے جو بہار کے دینی مرکز پھلواری شریف میں لکھی گئی۔ یہ مثنوی ۲۳۰۴ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں کچھ سنجیدہ واقعات اور عشق و معرفت کی باتیں ہیں۔ ان مثنویوں کے بعد میر و سودا کے دور تک آتے آتے

سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں۔ خود میر نے 38 مثنویاں لکھیں۔ جن میں عشقیہ، مدحیہ، ہجویہ اور واقعاتی مثنویاں شامل ہیں "دریائے عشق" اور شعلہ عشق" میر کی شاہ کار مثنویاں ہیں۔ میر کی ان مثنویوں میں "داخلیت" زیادہ ہونے کے سبب ان میں تخلیقی اور جمالیاتی محاسن لطف دیتے ہیں میر کی طرح سودا نے بھی عشقیہ مدحیہ اور ہجویہ مثنویاں لکھیں جن کی تعداد 24 ہے۔ میر اور سودا کی مثنوی نگاری کے ضمن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ میر نے ایک مثنوی "اجگرنامہ" لکھی ہے جسے علامتی مثنوی کہہ سکتے ہیں۔ اس مثنوی میں میر نے خود کو اژدھا کے طور پر پیش کیا ہے اور اپنے زمانے کے شاعروں کو کیڑے مکوڑے چھپکلی، مینڈک اور لومڑی وغیرہ کہا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اژدہا ایک ہی سانس میں سب کو نگل جاتا ہے۔

اسی طرح سودا نے مثنوی "سبیل ہدایت" میں مولانا روم کے اشعار کی شرح پیش کی ہے اور تنقیدی خیالات ظاہر کئے ہیں۔

میر و سودا کے زمانے کے ہی خواجہ میر اثر (م۔ ۱۷۹۴) کی مثنوی "خواب و خیال" کا شمار آج بھی اردو کی اہم مثنویوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کی سب سے مشہور مثنوی میر حسن (م۔ ۱۷۸۶) کی مثنوی "سحر البیان" ہے۔

اس مثنوی نے اردو میں مثنوی نگاری کے فن کو آسمان پر پہنچا دیا۔ میر حسن نے کئی مثنویاں لکھیں۔ (۱) مثنوی شادی آصف الدولہ (۲) مثنوی رموز العارفین (۳) مثنوی گلزار ارم (۴) مثنوی در وصف قصر، جواہر اور (۵) مثنوی سحر البیان لیکن میر حسن کی ہی نہیں اردو کی سب سے مشہور و ممتاز مثنوی سحر البیان ہے۔ جس کی وجہ سے میر حسن کا نام مثنوی نگاری کی تاریخ میں سب سے پہلے آتا ہے۔ میر حسن نے یہ مثنوی اپنی آخری عمر میں ۸۵-۱۷۸۴ میں مکمل کی۔ ۲۱۷۹ اشعار کی اس مثنوی میں وہ تمام فنی، لسانی اور جمالیاتی خوبیاں موجود ہیں جو کسی بھی مثنوی کو شاہکار بنا سکتی ہیں۔ سحر البیان میں منظر نگاری، جذبات نگاری، کردار نگاری اور تہذیبی روایات و اقدار کی ترجمانی کے بے مثال نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

میر حسن کے زمانے میں کئی مثنویاں لکھی گئیں لیکن سب سے مشہور دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" ہے۔ انیسویں صدی میں بھی کئی مثنویاں لکھی گئیں۔ مشہور غزل گو شاعر مومن خاں مومن نے بارہ مثنویاں لکھیں جن میں سے سات عشقیہ مثنویاں ہیں، دو مثنویاں تاریخی ہیں، ایک مثنوی جہادیہ ہے۔ مومن کی سب سے مشہور مثنوی "قول غمیں" کو مانا جاتا ہے۔ جس میں

مومن نے خود اپنے عشق کا قصہ بیان کیا ہے۔ مومن کو ایک خاتون سے عشق تھا جن کا نام تو امتہ الفاطمہ تھا لیکن ان کا لقب "صاحب جی" تھا۔ غزلوں کی طرح اپنی مثنویوں میں بھی مومن کا اسلوب حقیقت پسندانہ ہے۔ انیسویں صدی کی ایک بے حد مشہور اور مقبول مثنوی نواب مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" ہے۔ مثنوی زہر عشق ایک مختصر مثنوی ہے جس میں ایک سوداگر کے بیٹے اور ایک اعلیٰ نسب دوشیزہ مہہ جبیں کے عشق کی المیہ داستان بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں ہیروئن عشق میں ناکامی کے سبب خودکشی کرلیتی ہے۔ دردناک اور پُراثر اسلوب بیان کی وجہ سے اس مثنوی کو شاہکار مانا جاتا ہے۔ مرزا شوق نے دو اور مثنویاں بھی لکھی ہیں ۔
(۱) فریب عشق (۲) بہار عشق۔ لیکن شہرت زہر عشق کی ہی ہوئی جو آج تک برقرار ہے۔ شمالی ہند میں سلطنت اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ سے بھی ۹ (نو) مثنویاں منسوب ہیں (۱) افسانہ عشق (۲) دریائے عشق (۳) بحر الفت (۴) مثنوی گنا (۵) عشق نامہ (۶) حزن اختر (۷) خطابات محلات ہیبت حیدری (۸) ثبات القلوب۔

بیسویں صدی کے آغاز میں بھی کئی مثنویاں منظر عام پر آئیں جن میں

امیر مینائی کی مثنوی "کارنامہ عشرت" داغ دہلوی کی مثنوی "فریاد داغ" شوق قدوائی کی "ترانۂ شوق" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح محمد حسین آزاد سے بھی کئی مثنویاں منسوب ہیں جن میں سے "شب قدر" زیادہ مشہور ہے۔ اسی طرح مولانا الطاف حسین حالی نے بھی کئی مثنویاں لکھیں جو موضوعاتی نظموں کے طور پر مشہور ہیں لیکن ہیئتی اعتبار سے انہیں مثنوی کے زمرے میں رکھا جاتا ہے مثلاً (۱) نشاط امید (۲) برکھارُت (۳) حب وطن (۴) مناظرہ رحم والنصاف اور (۵) مناجات بیوہ وغیرہ ان میں مناجات بیوہ زیادہ مشہور ہے اور اسے اس کے موضوع کی بنیاد پر اردو کی پہلی جدید مثنوی بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ مولانا شبلی نے بھی "صبح امید" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ لیکن جدید دور میں علامہ اقبال نے آزاد اور حالی کے انداز میں چند نظمیں لکھیں جنہیں ان کی ہیئت کی بنا پر مثنوی کہنا غلط نہیں ہوگا۔ جیسے (۱) انسان اور بزم قدرت (۲) خفتگان خاک سے استفسار (۳) سید کی لوح تربت پر (۴) رخصت اے بزم جہاں (۵) گورستان شاہی (۶) والدہ مرحومہ کی یاد میں اور (۷) پنجاب کے دہقان سے" وغیرہ۔ لیکن اقبال کی اردو مثنویوں میں "ساقی نامہ" ایک شاہکار مثنوی ہے جس میں موضوع ہی نہیں ہیئت وتکنیک

کے اعتبار سے بھی جدت اور ندرت ہے۔ "بال جبریل" میں شامل یہ مثنوی ۹۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی کو کئی بندوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر بند کے آخر میں ایک تتمے کا شعر ہے۔ اقبال نے "ساقی نامہ" کی طرح اور بھی کئی طویل اور مختصر مثنویاں اجتہادی انداز میں لکھیں اور مثنوی کے موضوعاتی، ہیئتی اور جمالیاتی امکانات کو وسیع سے وسیع تر کیا۔ بعد میں مشہور ترقی پسند شاعر اور دانشور علی سردار جعفری نے ۱۹۴۶ میں اقبال کی ساقی نامہ کی طرز پر ایک مثنوی جمہور نامہ لکھی۔ اس مثنوی کو خود سردار جعفری نے اپنے عہد کا رزمیہ کہا ہے۔ ایک اور مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی نے تقسیم سے پہلے ہندوستان کے مختلف علاقوں بنگال، بہار، پنجاب، اور مہاراشٹر میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں ایک مثنوی "خانہ جنگی" کے نام سے لکھی جس میں مذہب کے نام پر انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کی ہی خوں ریزی پر خون کے آنسو روئے ہیں۔ ملک میں امن اور شانتی قائم کرنے غرض سے مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر نے بھی "امن نامہ" کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں جنگ کی تباہ کاریوں کی مذمت کرتے ہوئے امن عالم کے قیام کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

مثنوی کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا کام تنقیدی سے زیادہ تحقیقی ہے۔ ان کی تصنیف "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" اصلاً ان کا پہلا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۹ میں اور پھر دوسری بار ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۱ء میں "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت میں ہی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بحیثیت صنف سخن کے مثنوی کے تئیں اردو تحقیق کے صنفی رویّے کو بے نقاب کرتے ہوئے، اپنے مقدمہ میں لکھا کہ

> "اردو میں تحقیق کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ اردو مثنوی پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ غزل کے بعد ہمارے شاعروں نے جس صنف سخن پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی، وہ مثنوی ہی ہے۔ غزل پر تو ان چند برسوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن مثنوی کا کوئی پرسان حال بھی نہیں۔ امیر احمد علوی نے "مثنویات" پر ایک مقالہ ۱۹۲۵ء میں "نگار" کے لیے لکھا تھا۔ یہی بعد میں کتابی صورت

میں شائع کر دیا گیا۔ عبدالقادر سروری کی کتاب "اردو مثنوی کا ارتقا" بھی تقریباً بیس برس پہلے لکھی گئی تھی۔ جلال الدین جعفری کی کتاب "تاریخ مثنویات اردو" کے نام سے دوبار شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی نوعیت تاریخی اور تحقیقی نہیں۔ اس میں زیادہ توجہ مشہور اردو مثنویوں کا انتخاب پیش کرنے پر صرف کی گئی ہے۔" ؎۱

مثنوی کے حوالے سے سنجیدہ تحقیق کے ساتھ اردو مثنویوں کا صحیح اور ضروری تناظرات میں اردو میں مثنوی کے سرمایہ کا سائنٹفک تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت پر زور ڈالتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے واضح کیا کہ۔

"اردو مثنویوں کی قدر و قیمت جاننے اور تاریخ ادب میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا جائزہ تاریخی و معاشرتی پس منظر کے ساتھ لیا جائے اردو ادب نے فارسی سے بہت کچھ لیا۔ اس میں ایرانی اور اسلامی روایات کا رنگ بھی گہرا ہے۔ لیکن یہ ہندوستان

؎۱ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۷

سے بیگانہ محض نہیں ہے۔ اس نے یہاں کے ماحول، معاشرت اور تہذیب و تمدن کے اثرات بھی قبول کئے ہیں۔ اردو کی دوسری اصناف سخن کی طرح ہماری مثنویاں بھی اس اخذ و قبول، اختلاط اور اشتراک کا پتا دیتی ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے سابقے کے بعد یہاں تہذیبی اور معاشرتی سطح پر کارفرما رہا۔ قدیم مثنویوں میں عموماً قصے کہانیاں بیان کی جاتی تھیں۔ جن کا گہرا تعلق قومی روایات، مذہب اور معاشرت سے ہوتا تھا۔ ہماری مثنویاں چونکہ مشترک تہذیب اور ملی جلی معاشرت کے زیر اثر لکھی گئیں۔ اس لیے ان میں اسلامی قصے کہانیوں کے علاوہ ہندوستانی لوک کتھاؤں اور عوامی روایتوں سے متاثر ہونے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اسی رجحان کا معروضی اور تنقیدی و تحقیقی نقطۂ نظر سے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جائزہ لیا ہے۔"[۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی اس تصنیف میں تاریخی اور تحقیقی رویّوں کے ساتھ

۱۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۹-۱۸

اردو مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں دکن ابتدائی مثنویوں سے لے کر شمالی ہند کی دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ تک کی تمام اہم مثنویوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مثنوی کے حوالے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تحقیق و تنقید نگاری کا جائزہ ذیل میں پیش کیے گئے مختصر اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ " اردو ادب کا باقاعدہ فروغ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کی سرپرستی میں دسویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اسی زمانے میں ایک درباری شاعر وجہی نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی واردات عشق کو مثنوی " قطب مشتری " میں شاعرانہ انداز سے پیش کیا۔ غواصی نے جہاں الف لیلہ کی کہانیوں پر مبنی ایک مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال لکھی۔ وہاں دو اور مثنویاں " طوطی نامہ " اور " مینا و ستونتی " ہندوستانی موضوعات پر بھی تصنیف کیں۔ نصرتی نے " منوہر اور مدھو مالتی " کے مشہور قصے کو نظم کا جامہ پہنایا۔ اس کی ایک مثنوی " علی نامہ " ایک رزمیہ کارنامہ ہے۔ جس میں علی بادشاہ اور مغلوں اور شیواجی کی جنگوں کا

احوال بیان کیا گیا ہے۔" ۱؎

پروفیسر نارنگ نے اپنی مذکورہ تصنیف میں مختلف اور متعدد نمایندہ مثنویوں کا جائزہ لیا ہے اور اپنی تنقیدی رائے ظاہر کی ہے۔ مثال کے طور پر میر کی مثنوی "مورنامہ" کے بارے میں لکھا ہے۔

۲۔ "بظاہر اس مثنوی کا قصہ غیر فطری معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک میر نے اسے تمثیل (ALLEGORY) کے انداز پر نظم کیا ہے مثنوی کے مرکزی کرداروں کا اگر غور سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ راجا رانی اور مور محض نام ہی نام ہیں میر نے انہیں حسن و عشق کی بنیادی قوتوں کی تمثیل بنا کے پیش کیا ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں۔

فتنۂ در سر عشق کے یہ کام ہیں
مور از در رانی راجا نام ہیں

مور دراصل عشق ہے، رانی حسن ہے اور راجا حسد کی نمایندگی

۱؎ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۹

کرتا ہے میر نے حسن و عشق کے سوز و ساز اور حسد و
رقابت کی آویزش و پیکار کے ازلی افسانے کو ایک
نئے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے عشق کی اہمیت و
عظمت کے اسی مقدمے کو پھر دہرایا ہے جسے وہ اپنی
عشقیہ مثنویوں میں اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکے تھے" ؂۱

اسی طرح میر حسن کی مشہور مثنوی "سحر البیان" کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی تنقیدی رائے ان الفاظ میں دی ہے۔

" میر حسن نے (اپنی مثنوی میں) نئی طرز اور نئی زبان کا
دعویٰ کیا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے۔ زبان نئی اس لیے کہ جس
زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی۔ لکھنؤ کے شاعر دبستان دہلی
کی شیریں بیان اور سادہ گوئی کی روشوں سے منحرف
ہونے لگے تھے۔ نئی طرز اس لیے کہ یہ نہ کسی فارسی مثنوی
کا ترجمہ ہے اور نہ کسی بندھے ٹکے قصے پر مبنی ہے۔
میر حسن کا قصہ طبع زاد ہے اور اس کا رنگ و آہنگ

؂۱ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۴۲-۱۴۱

مخلوط تہذیب و معاشرت سے لیا گیا ہے۔ حیرت و
استعجاب کا عنصر پیدا کرنے کے لیے میر حسن نے
قصے کی جائے وقوع کو صیغہ راز میں رکھا ہے۔"[۱]

اسی طرح دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" کے بارے میں جو مشہور قصہ "گل بکاولی" پر مبنی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"دیا شنکر نسیم بلا کے ذہین اور طباع آدمی تھے زبان اور
بیان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی ...... ان
کی مثنوی اردو کے زندہ جاوید کارناموں میں شمار کی جاتی
ہے۔ نسیم بلاغت اور معنی آفرینی پر جان چھڑکتے تھے
میر حسن کا سا سوز و گداز ان کے یہاں نہیں۔ نہ وہ روزمرے
اور محاورے کے بادشاہ ہیں۔ لیکن شوکت الفاظ، اختصار
تناسب لفظی، بلند پروازی، باریک بینی، استعاروں کی
نزاکت اور تشبیہوں کی پختگی میں ان کا ایک خاص رنگ

۱۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۳۱۴

ہے۔ وہ لکھنؤ کی رنگین، لوچدار اور مرصع زبان کے نمایندہ
شاعر ہیں، طبیعت چونکہ مشکل پسندی پر مائل تھی ریلات
اور گھلاوٹ ان کے کلام میں نہیں۔ البتہ کہیں کہیں تکلفات
سے ہٹ کر بڑے ہی سادہ اور برجستہ شعر کہے ہیں۔
جو ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں"۔ ع ۱

غرض یہ کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو مثنوی کے حوالے سے الگ الگ مثنویوں، مثنوی نگاروں ان مثنویوں کی زبان۔ موضوعات، اسالیب اور ذاتی انفراد و اجتہاد کے حوالے سے جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں تاریخی حوالوں اور لسانی تجزیوں کے ساتھ تنقید نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

غزل اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

اگر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تمام تصنیفات کو ذہن میں رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پروفیسر موصوف نے اردو شاعری کے حوالے سے اپنی متعدد تصنیفات میں کسی نہ کسی حوالے سے صنف غزل کے بارے میں اپنے تنقیدی

ع ۱ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ ۲۳۶

خیالات ظاہر کئے ہیں۔ خاص طور پر مختلف شاعروں مثلاً ولیؔ، میر تقی میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فراقؔ اور دیگر ممتاز شاعروں کے فن سے بحث کرتے ہوئے فن شناسی کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں جن سے صنف غزل کی موضوعاتی، ہیئتی، لسانی، اور جمالیاتی تغیرّات، غزل کی صورت حال اور غزل کے امکانات کا عرفان حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ غزل اور گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کا طویل مقالے کا عنوان ہوسکتا ہے جس کی اس مقالے میں گنجائش نہیں اس لیے زیر بحث عنوان کے تحت اختصار کے ساتھ چند نکات کی نشاندہی پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ غزل کے صنفی امتیازات کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:-

۱۔ "غزل سے متعلق کسی قسم کی گفتگو کرنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ غزل کے شرارہ معنوی کا تعلق اس ذہنی شعلے سے ہے جو اسلامی اور ہندوستانی تہذیبوں کے اختلاط سے پیدا ہوا۔ اس شرارہ کی تب و تاب قائم رکھنے میں سب سے زیادہ مدد اسلامی تصوّف سے ملی۔ اردو غزل نے تصوف کی گود میں آنکھ کھولی اور

وہ حال و قال کی محفلوں اور صوفیوں اور درویشوں کی صحبتوں میں پروان چڑھی۔ چنانچہ غزل کے تصور عشق کی نوعیت سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلامی تصوف میں سب سے زیادہ وقعت عشق حقیقی کو حاصل تھی لیکن اس کے لیے عشق مجازی کی اہمیت پر جو زور دیا جاتا ہے اس کی تہذیبی اور نظریاتی نہج کیا ہے..... اردو غزل میں زیادہ تعداد ان شاعروں کی ہے جو تصوف کے اصلی حقیقی پہلو سے نہیں بلکہ اس کے روایتی مجازی پہلو سے متاثر ہوئے..... وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی رواجاً عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دیتے تو ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا تصور عشق فرا مجازی اور زمینی ہے۔" ۱

اردو غزل کو عرف عام میں حسن و عشق کے جذبات و تصورات کی ترجمانی کرنے والی صنف مانا جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غزل کے حوالے سے حسن و جمال، تصوف و رواداری کے بارے میں جن تنقیدی خیالات کا

---

۱ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب۔ گوپی چند نارنگ ص ۱۱۲

اظہار کیا ہے وہ غزل کے فنی مضمرات اور جمالیاتی امکانات سے متعلق ان کی آگہی کے عکاس ہیں مثلاً

۲۔ "تصورِ عشق کی طرح اردو غزل کا تصورِ حسن و جمال بھی ہندوستانی فضا کا پروردہ ہے اردو غزل کے بارے میں یہ غلط فہمی افسوس ناک حد تک عام ہے کہ اس کا محبوب فارسی غزل یا ایرانی غزل سے جوں کا توں لے لیا گیا ہے ......
اردو غزل نے احساسِ جمال کی ہندی اور ایرانی دونوں راہوں پر چل کر دیکھا اور ان میں سے کوئی بھی راہ اِسے راس نہ آئی۔ ہندی روش کو اس لیے ترک کر دینا پڑا کہ وہ ہند ایرانی معاشرت کے پردہ اور ربط ضبط کے قاعدوں کے خلاف تھی اور ایرانی روش اس لیے قابل قبول نہ ٹھہری کہ وہ بڑی حد تک غیر فطری تھی اور ہندوستانی ذہن کے جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل نہ تھی چنانچہ اردو غزل نے اعتدال کی راہ نکالی اور ایرانی و ہندی تصورات کے امتزاج سے ایک نیا تصور قائم کیا۔"[۱]

۱۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۷۱

غزل کے تصورِ حسن و جمال کی غیر روایتی توضیح و تعبیر پروفیسر نارنگ نے محمد قلی قطب شاہ، ولی، سراج، سودا، میر، راسخ، مصحفی، انشا، آتش، غالب، ذوق، مومن، داغ، امیر مینائی سے لے کر حالی، حسرت اور فراق گورکھپوری تک کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے کیا ہے اور اردو غزل کے حوالے سے جو نتائج اخذ کیے ہیں اس کا اندازہ کچھ تو مندرجہ بالا اقتباسات سے ہوتا ہے لیکن مختلف غزل گو شعرا کے انفراد و امتیاز کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جو فیصلہ کن جملے لکھے ہیں ان سے بھی اردو غزل کے فنی محاسن معیار، مزاج اور فنی و جمالیاتی اقدار کی تہیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ چند ایک عبارتیں دیکھئے۔

۱۔ "محمد قلی کا کمال حسن و جمال کی ارضیت اور بدنیت ہے۔
وہ حسن کے طربیہ وجدان کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے
پر بے پناہ قدرت رکھتا ہے۔ اس سے رنگ اور رس
کی ایسی فضا تیار کرتا ہے کہ دیدہ و دل دونوں اس میں
جذب ہو جاتے ہیں۔" [۱]

۲۔ "ولی سے اردو شاعری ایک واضح موڑ مڑنے لگتی ہے۔

---

[۱] اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۷۳

ولی کے زمانے میں مغلیہ فتوحات کی وجہ سے دکن
کی معاشرت پر شمالی ہند کے تہذیبی اثرات کی چھاپ
لگنے لگی تھی۔ ولی نے نہ صرف دکن میں بیٹھے ہوئے اس
کا اثر قبول کیا بلکہ شمالی ہندوستان کے سفر کے دوران
بھی اس سے بلا واسطہ اثر لیا اور ہندی تصورات کے ساتھ
ساتھ فارسی مضامین بھی غزل میں بجسنہ باندھنے شروع
کر دیئے۔ غرض اس طرح ولی کی غزل نے پہلی بار اردو
کی صلاحیتوں اور اس کے امکانات کو وسیع کیا۔" [۱]

غزل کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری غزل کے بنیادی موضوعات کے حوالے سے بھی سامنے آتی ہے۔ غزل کے بنیادی موضوعات تین ہیں۔ ۱۔ عشق ۲۔ تصوف ۳۔ آزادہ روی۔

غزل کے تصورِ عشق کے بارے میں پروفیسر نارنگ نے لکھا ہے۔

" اردو غزل کے تصورِ عشق سے بحث کرتے ہوئے اس کے
تہذیبی اور سماجی تناظر پر نظر رکھنا ضروری ہے اس سلسلے

---

[۱] اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۰۶

میں ہمارے اکثر نقاد چونکہ نقطوں کے طلسم میں کھو جاتے ہیں اور تاریخی اور تہذیبی بصیرت سے کام لیتے ہوئے عشق کے تہذیبی اور معاشرتی روابط کا پتا چلانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس لیے اردو کی عشقیہ شاعری کا مزاج سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ذہن چونکہ پہلے سے مخصوص تصورات کا شکار رہتے ہیں، وہ غزل کو پاک عشق اور ناپاک عشق کی فرسودہ اور بے معنی بحث میں اُلجھا کر اپنی تنقید سے خود لطف اندوز ہوتے ہیں۔"[۱]

پروفیسر نارنگ نے عشق کے مضمرات اور کیفیات سے بحث کرتے ہوئے اشعار کے حوالے سے جو توضیحات پیش کی ہیں ان سب کے حوالے یہاں نقل کرنا ممکن نہیں لیکن انہیں ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح پروفیسر نارنگ نے غزل کے تصورِ حسن کے بارے میں بھی مشترکہ تہذیب کے حوالے سے لکھا ہے۔

"اردو غزل میں زیادہ تعداد ان شاعروں کی ہے جو تصوف

۱۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب۔ گوپی چند نارنگ ص ۱۱۱

کے اصلی حقیقی پہلو سے نہیں بلکہ اس کے روایتی پہلو سے
متاثر ہوئے۔ یہ دوسری طرح کے شعرا جو تصوف کے
روایتی پہلو سے متاثر ہوئے وہ بظاہر تصوف کا دم
بھرتے ہیں لیکن دراصل تعینات کی حد یعنی اپنے معشوق
کے ارضی وجود سے آگے نہیں بڑھ سکے اور اس کی الفت
اور درد و سوز کو سرمایہ حیات سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے
رہتے ہیں۔ ان شاعروں کے ہاں تصوف کے مضامین تو
بندھے ملیں گے لیکن ان کی زندگی سے ان متصوفانہ مضامین
کا تعلق برائے نام ہے وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی رواجاً
عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن واقعہ
یہ ہے کہ ان کا تصور عشق تر امجازی اور زمینی ہے۔ [۱]

پروفیسر نارنگ نے عشقیہ اور صوفیانہ غزل کے علاوہ غیر متصوفانہ غزل، تہذیبی و
ثقافتی غزل کا بھی تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن چونکہ غزل

---

[۱] اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۱۶

خصوصاً اردو غزل پر ہندو عقائد و نظریات اور اسلامی تعلیمات اور اصولوں کے بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں اسی لیے غزل کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر نارنگ نے غزل کے ہندو اور اسلامی اقدار و تعلیمات اور ہندوستان کے مشترکہ رسوم و رواج اور مفروضات و روایات کے حوالے سے اردو غزل کے مزاج و معیار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور اس اعتبار سے اردو غزل کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری اردو تنقید میں ایک اضافے کا حکم رکھتی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اور مرثیہ کا فن

غزل کے علاوہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو کی دوسری مقبول ترین صنف شاعری "مرثیہ" کے فنی، ہیتی، لسانی اور جمالیاتی مضمرات اور امکانات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے لیکن اپنے مخصوص عملی اور اطلاقی طریقۂ نقد کے حوالے سے۔ یوں بھی پروفیسر نارنگ سے اس کی توقع تو نہیں کی جانی چاہیئے کہ وہ مرثیہ پر لکھتے ہوئے مکتبی یا تدریسی انداز میں مرثیہ کی ابتدا اور ارتقا اور مرثیہ نگاروں کے حالات زندگی بیان کرتے۔ چنانچہ مرثیہ کا

تنقیدی جائزہ انہوں نے اپنی متعدد تحریروں مثلاً

۱۔ اسلوبیات انیسؔ

۲۔ مراثی انیسؔ میں ہندوستانی عناصر۔ اور

۳۔ کربلا بطور ایک شعری استعارہ

وغیرہ میں تنقید کی عام روایت اور رویہ سے ہٹ کر لیا ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر نارنگ نے سب سے پہلے مرثیہ کے لیے مسدس کی ہیئت کی ایجاد اور رواج کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی بلیغ اشارے کئے ہیں جو مرثیہ کی تنقید میں اضافہ کا حکم رکھتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ " انیسؔ جس فصاحت کا دعویٰ کرتے ہیں اور شبلی اور ان کے بعد آنے والے نقاد انیسؔ کی جس فصاحت کی داد دیتے ہیں کہیں اس کا گہرا تعلق "مسدّس" کے فارم کو انتہائی فن کاری کے ساتھ برتنے میں تو نہیں ؟ اور اگر ایسا ہے تو انیسؔ نے مسدّس کو اس مقام تک پہنچانے میں اردو کی شعری روایت کے کن اجزاء کی تقلیب کی اور کن مسائل کو برتا ؟ مسدّس انیسؔ کی ایجاد نہیں۔ مرثیے کیلئے

مسدّس کا فارم انیسؔ سے مدّتوں پہلے رائج ہو چکا تھا۔
انیسؔ نے اسے جلا دی اور ایسی فنی بلندی تک پہنچا دیا کہ
یہ ہیئت اردو میں لازوال ہو گئی اور اس کے اثرات بعد
میں آنے والے نظم گو شاعر بھی قبول کرتے رہے۔" ؎۱

اردو مرثیہ کی ہیئتی تبدیلیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نارنگ نے لکھا ہے کہ

۲۔ "شروع میں مرثیہ غزل اور مثنوی کی ہیئت میں
نظم ہوتا تھا۔ اس لیے کہ سوز خوانی اور لحن کے طرز میں پڑھنے
کے لیے یہ فارم نہایت موزوں تھے ؎۲ اسی طرح مربع
اور دو بیتی مرثیے بھی لکھے گئے۔ میرؔ اور سوداؔ کے زمانے
تک نظم کی ہر شکل میں مرثیہ کہا گیا۔ اس زمانے میں مرثیے
نے دراصل ادبی منصب حاصل نہیں کیا تھا۔ مرثیہ صرف
رونے رلانے اور ثواب کمانے کی چیز تھا۔" بگڑا شاعر

؎۱ اسلوبیات انیس۔ از گوپی چند نارنگ۔ مشمولہ انیس شناسی ص ۱۶۳

؎۲ بحوالہ اردو مرثیہ طبع الہ آباد ۱۹۸۵ء۔ ص ۸

مرثیہ گو کی کہاوت اسی زمانے سے چلی ہو گی۔ لیکن میر و سودا کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے، مرثیہ سے ادبی تقاضے شروع ہو گئے۔ مسیح الزماں کا یہ بیان صحیح ہے کہ سودا کی طبیعت ہمہ گیر تھی انہوں نے اپنی ذہانت اور جدت فکر سے نئے نئے پہلو نکالے اور مرثیے کو ادبی حیثیت دینے کے لیے مختلف راستوں سے چل کر "مسدس" تک پہنچے۔ اگرچہ سودا نے مخمس، مستزاد دہرا بند کئی صورتوں میں مرثیے لکھے۔ لیکن پہلا مسدس مرثیہ کہنے کا سہرا عام طور پر سودا ہی کے سر ہے .... اس وقت تک مرثیے کے لیے قصیدہ، مربع، ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس مستزاد سب آزمائے جا چکے تھے۔ لیکن جس فنی وسیلے سے مسدس کی مخصوص صوتی کیفیت اور ہیئتی ڈرامائیت کی طرف پہلا قدم اُٹھایا گیا وہ ان مرثیوں کا رواج تھا جن میں فارسی یا برج بھاشا کی بیت یا آخری مصرع بطور ٹیپ استعمال ہوتا تھا اور کبھی ہر بند کو مختلف مصرعوں سے پابند

کیا جاتا تھا۔ بعض مرثیوں میں یہ صورت بھی نظر آتی ہے
کہ چار مصرعے ایک بحر میں ہیں اور بیت دوسری بحر
میں، مسدس میں چار مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے اور پھر
بیت میں قافیہ کے بدل جانے یعنی اصوات اور آہنگ
کی اس برابر جاری رہنے والی تبدیلی کے زیر و بم میں
جو زبردست جمالیاتی اور ڈرامائی امکانات تھے ان
کی کشش شاید سب سے پہلے انہیں تجربوں میں محسوس
کر لی گئی تھی۔ بہر حال اتنا معلوم ہے کہ "مسدّس" میر اور
سوؔدا کے زمانے میں رائج ہو چکا تھا"۔[ع۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مرثیہ کے لیے مسدّس کی ہیئت کی ایجاد اور ارتقا پر ہی روشنی نہیں ڈالی ہے بلکہ مرثیہ کے لیے مسدس کی ہیئت کی تشکیل کے لسانی، شعری، تہذیبی اور نفسیاتی اسباب پر غور کرتے ہوئے بالکل ہی نادر و نایاب تحقیقی و تنقیدی گوشے اجاگر کیے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں۔

ع۱۔ اسلوبیات انیسؔ۔ مشمولہ انیس شناسی۔ مرتبہ گوپی چند نارنگ صفحہ ۱۶۴

"..... ہماری کلاسیکی شاعری عبارت ہے۔ غزل، قصیدہ
مثنوی، رباعی سے۔ جب یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ
مرثیہ اردو شاعری کی خالص اپنی ہیئت کا مظہر ہے تو کہیں
ایسا تو نہیں کہ مرثیے کے مسدس کی تشکیل میں ان چاروں
اصناف کا جوہر تحلیل ہو گیا ہو۔؟" ع۱

پروفیسر نارنگ نے نظریے کی حمایت میں انیسؔ کے مراثی میں غزل، قصیدہ مثنوی اور رباعی کے عناصر اور مزاج کی نشاندہی بھی کی ہے اور باتوں کے علاوہ اس طرح کے دانشورانہ تنقیدی جائزے میں عملی تنقید کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

اردو مرثیہ کے مطالعہ کے حوالے سے مراثی میں ہندوستانی عناصر کی موجودگی کے بارے میں کافی بحثیں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس موضوع پر مختلف انداز سے بحث کرتے ہوئے پہلے تو یہ سوال قائم کیا ہے کہ

"شہدائے کربلا کے بیان میں ہندوستانی معاشرت کا ذکر

ع۱ اسلوبیاتِ انیسؔ۔ مشمولہ انیس شناسی، مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ صـ ۱۹۶

اردو مرثیوں کی خوبی تسلیم کیا جائے یا خامی ؟ اس کا
ہونا مناسب قرار دیا جائے یا نامناسب؟"۔ ؎۱

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مختلف مراثی کے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے جن میں ہندوستانیت کے مظہر الفاظ و تراکیب اصطلاحات و استعارات کا استعمال ہوا ہے مثلاً۔ مہندی، سہرا، لگن دھرنا سر پٹینا، کنگنا، اوڑھنی، رنڈسالہ، تلک، کلاوا، آرسی مصحف، لال، چنیر کا نکالنا، مسند، پرسا، نتھ، چوڑیاں وغیرہ" اور پھر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے عالمانہ انداز میں اس کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے یہ منطقی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

"اگر انیسؔ نے عرب کرداروں کو ہندوستانی لب و لہجہ
نہ دیا ہوتا اور ہندوستانی رسم و رواج کا پابند نہ بنایا ہوتا
جب بھی دل سے ان کا احترام کیا جاتا۔ لیکن ان کے
ساتھ "اپنائیت کا احساس اس قدر شدت سے محسوس
نہ ہوتا" گویا انیسؔ نے عمداً اپنے کرداروں کو ہندوستانی
رنگ دیا، کیونکہ انہیں احساس تھا کہ ہندوستانی رنگ

؎۱ مراثی انیس میں ہندوستانیت۔ از گوپی چند نارنگ۔ مشمولہ۔ انیسؔ شناسی ص ۱۴۰

میں پیش کئے گئے عباسؓ اور زینبؓ ہندوستانیوں کے
دل سے زیادہ قریب ہوں گے۔۔۔۔۔ ہندوستانی معاشرت
کی ترجمان صرف شادی بیاہ کی رسموں تک محدود نہیں
بلکہ بچپن میں پالنے کی معصوم مسکراہٹوں سے لے کر موت
تک کے مراحل کی معاشرتی ترجمانی کا حق ادا کیا گیا ہے۔" ع۱

مرثیے کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تصنیف کربلا بطور ایک شعری استعارہ ایک اعتبار سے مرثیہ کی صنفی حیثیت ہی نہیں مرثیہ کی شعریات کے حوالے سے بھی اردو میں تنقیدی رویہ کے ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔

گوپی چند نارنگ اور افسانہ کی تنقید

اردو میں افسانہ کی تنقید کا آغاز خود اردو کے پہلے باضابطہ اور عظیم افسانہ نگار پریم چند کے ہاتھوں ہوا۔ پریم چند نے اپنے پہلے افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" کے دیباچے میں" افسانہ کے فنی لوازمات اور غرض و غایت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں افسانہ کے حوالے سے تنقیدی خیالات

ع۱ مراثی انیس میں ہندوستانیت۔ از۔ گوپی چند نارنگ، مشمولہ انیس شناسی۔ ص ۴۵۔۴۴

ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیئے ۔اس کے علاوہ پریم چند کی بعض دوسری تحریروں مثلاً

۱۔ میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں۔

۲۔ میرے بہترین افسانے

۳۔ ہماری قوت بیانیہ کا زوال

۴۔ مختصر افسانہ

۵۔ مختصر افسانے کا فن

۶۔ راشد الخیری کے افسانے

وغیرہ سے اول تو افسانہ کے بارے میں پریم چند کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ کہنے کا جواز بھی پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں افسانہ کی تنقید کی بنیاد پریم چند نے ہی رکھی کیونکہ پریم چند سے پہلے اردو مختصر افسانہ کی تنقید کے حوالے سے کوئی باضابطہ تحریر نہیں ملتی۔ پریم چند کی تنقیدی تحریریں ۱۹۰۸ سے لے کر ۱۹۳۲ کے دوران شائع ہوئیں۔ البتہ ۱۹۲۰ء کے بعد افسانہ کے حوالے سے بعض تحریریں ضرور سامنے آتی ہیں لیکن ان تنقیدی تحریروں میں بقول ڈاکٹر ارتضٰی کریم "مختصر افسانہ" کو "فسانہ" کے معنی میں استعمال کرکے

اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے یعنی داستان حکایت منظوم داستانیں یا مثنویاں وغیرہ۔ خود عبدالقادر سروری اور مجنوں گورکھپوری کے یہاں بھی ایسا ہی رویہ ملتا ہے۔ افسانہ کی تنقید کے ابتدائی نمونوں کے عنوانات دیکھ کر ہی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ فن قصہ نویسی' از ضیاء الدین شمسی۔ مطبوعہ رسالہ ہمایوں' مئی تا نومبر ۱۹۲۲ء

۲۔ فن افسانہ نگاری۔ از محمد عبدالقادر سروری۔ مطبوعہ "نگار" دسمبر ۱۹۲۶ء

۳۔ "افسانہ کی ماہیت" از۔ حبیب احمد صدیقی۔ مطبوعہ ہمایوں۔ نومبر ۱۹۲۷ء

۴۔ کہانی کا سفر" از ایم ضیاء الدین۔ مطبوعہ "نیرنگ خیال۔ جون ۱۹۳۱ء

۵۔ قصہ نویسی و قصہ خوانی۔ از محمد حسین ادیب۔ مطبوعہ۔ ہمایوں ستمبر تا نومبر ۱۹۳۲ء

۶۔ افسانے کے لیے مواد کی فراہمی۔ از محمد حسین ادیب۔ مطبوعہ۔ ہمایوں جنوری ۱۹۳۳ء

۷۔ عہد حاضر کے افسانہ نگار از حمورابی۔ مطبوعہ "نگار" مئی ۱۹۳۴ء

۸۔ افسانہ نویسی۔ از عظیم بیگ چغتائی۔ ساقی۔ جنوری ۱۹۳۵ء

۹۔ افسانہ نگاری کی قسمیں :۔ از عظیم بیگ چغتائی۔ مطبوعہ "ساقی" ۱۹۳۵ء[1]

اس طرح کے چند اور مضامین کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اردو مختصر افسانہ

---

[1] اردو فکشن کی تنقید۔ از ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ص ۴۰۔۴۱ ء

کی تنقید کا باضابطہ آغاز وقار عظیم اور ممتاز شیریں کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ خاص طور پر ممتاز شیریں کی تنقیدی تحریریں آج بھی یادگار مانی جاتی ہیں۔ وقار عظیم کے مضامین کا مجموعہ "داستان سے افسانے تک" ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا جبکہ ممتاز شیریں کے مضامین کا مجموعہ "معیار" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد۔ پروفیسر قمر رئیس، فردوس فاطمہ نصیر، جعفر رضا، شہزاد منظر وہاب اشرفی، مرزا حامد بیگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ متعدد چھوٹے بڑے ناقدین نے افسانہ کے حوالے سے اچھی اور بری ان گنت کتابیں لکھیں لیکن کئی اعتبار سے اردو افسانہ کی سب سے بہتر تنقید پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مرتب کردہ کتاب "اردو افسانہ روایت اور مسائل" میں نظر آتی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے افسانہ اور افسانہ نگاروں پر متعدد فکر انگیز تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ افسانہ کے حوالے سے متعدد سیمینار اور مذاکرے بھی منعقد کروا چکے ہیں۔ ان سیمیناروں اور مذاکروں میں پڑھے گئے مضامین پر مشتمل ان کی دو مرتب کردہ کتابیں اہم ہیں۔

۱۔ اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل۔ ۱۹۸۱ء

۲۔ نیا اردو افسانہ۔ انتخاب تجزیے اور مباحث ۱۹۸۸ء

اردو افسانہ روایت اور مسائل میں وہ مضامین شامل ہیں جو اردو افسانہ سیمینار ۱۹۸۰ء میں پیش کیے گئے اور وہ افسانے بھی جو افسانے کی تفہیم میں معاون ہو سکتے ہیں اور قبل کہیں شائع ہو چکے تھے جیسے ممتاز شیریں کا مقالہ "تکنیک کا تنوع" وغیرہ

چونکہ ۱۹۸۰ء تک آکر جدیدیت کا رجحان اپنے زوال کی حدیں چھو رہا تھا۔ اور "جدید افسانہ"، کہانی پن، بیانیہ اور علامتی و تجریدی اسلوب کے حوالے سے بے سمتی کا شکار ہو چکا تھا۔ افسانے کا قارئین سے رشتہ کمزور سے کمزور تر ہو چکا تھا۔ اس لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کتاب میں ایسے مضامین شامل کیے جن سے افسانہ کی روایت، عصری تقاضوں کی روشنی میں افسانہ کی شعریات کی نوعیت، افسانہ میں کہانی پن، بیانیہ اور اسلوب، افسانہ میں افسانہ نگار کی موجودگی یا غیاب وغیرہ مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خود پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کتاب کے دیباچے میں جدید افسانہ مسائل اور مضمرات سے بحث کرتے ہوئے کئی قابل غور باتیں کہی ہیں مثلاً

۱۔ "جدید افسانے کے اظہاراتی تجربے، فنی بلندیاں اور نئے نئے مسائل ہیں جو قابلِ غور ہیں۔ نیا افسانہ دراصل اس وقت ایک

ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی اگلی منزل کیا ہے۔؟''

۲۔ ''نئی کہانی نے نہایت بے رحمی سے فرسودہ ڈھانچے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کیا نئی کہانی جس حد تک وہ نئی ہے۔ کہانی نہیں ہے۔؟ یا جس حد تک وہ کہانی ہے وہ نئی نہیں ہے! کیا کہانی کا کہانی پن فرسودہ ڈھانچے کا ایسا عنصر ہے جس کی رد لازم ہے۔؟ کہانی خواہ وہ کتنی ہی انام، تجریدی، استعاراتی، تمثیلی، علامتی یا فنطاسیائی ہو۔ کیا کہانی پن کے بغیر اس کی تشخیص ممکن ہے''۔

۳۔ '' نئی کہانی زمان و مکان کے منطقی رشتوں کو لاشعوری سطح پر بدل دینے پر قادر سہی، لیکن زمین و آسمان کی وسعتوں میں اسے کہیں تو پیر ٹکانے ہی پڑتے ہیں اور کسی نہ کسی لمحے میں سانس تو لینی ہی پڑتی ہے۔ کہانی کتنی ہی آفاقی اور باطنی ہو۔ کیا واضح یا پوشیدہ طور پر وہ ہمیشہ سماج اور معاشرے سے جڑی نہیں رہتی؟''

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نیا افسانہ (یا جدید افسانہ) کے حوالے سے جو بنیادی سوالات قائم کئے ہیں ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ افسانہ کے فنی اور جمالیاتی دروبست کے مضمرات اور امکانات کی بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں اور ادب میں جدت اور ندرت کی حدول کی آگہی بھی رکھتے ہیں۔ کہانی نئی بھی ہو اور کہانی بھی کہلائے یا پھر دوسرے لفظوں میں کہانی کی ساخت میں جدت ہو پھر بھی وہ کہانی ہو۔ یہ افسانہ کی آگہی وہ منزل کہتے ہیں جہاں پر پہنچے بغیر کوئی بھی کہانی کار بڑی کہانی نہیں لکھ سکتا یا پھر دوسرے لفظوں میں کوئی بھی کہانی۔ اس صفت کے بغیر کہانی کار کو بڑا نہیں بنا سکتی۔ پروفیسر نارنگ نے اسی باریکی کو ذہن میں رکھ کر مذکورہ بالا سوالات قائم کئے ہیں جو اردو افسانہ کے صنفی امتیازات اور جدید افسانہ کے مسائل کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "پروفیسر گوپی چند نارنگ کے قائم کردہ یہ سوالات خود ساختہ نہیں تھے بلکہ اس زمانہ کے بدلتے ہوئے سماجی اور ثقافتی منظر نامے سے پیدا ہوئے تھے۔ اس دور میں کہانی پن کے حوالے سے نہ صرف افسانہ کے فن پر مردنی چھا رہی تھی بلکہ خود افسانہ نگاروں کا اپنا ادبی تشخص بھی داؤ پر لگا ہوا تھا۔ اس لیے کہ جدید افسانہ سے پہلے پریم چند،

راجندر سنگھ بیدی ۔ سعادت حسن منٹو ۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے علاوہ اور کئی افسانہ نگار اردو میں افسانہ نگاری کی ایک شاندار روایت قائم کر چکے تھے ۔ اس روایت میں موضوع، ہیئت اور اسلوب کی رنگا رنگی تھی ۔ اس لیے جدید افسانہ اور افسانہ نگاروں کے لیے اپنی جگہ بنانا بے حد دشوار تھا ۔ اس لیے کہ بقول ڈاکٹر ارتضیٰ کریم "نئے کہانی کاروں کے پاس نہ زبان تھی ۔ نہ گہرا تیز مشاہدہ، لے دے کے نئی علامتوں کی بیساکھی تھی ۔ استعاروں اور بے ربط تشبیہوں کا بھونڈا استعمال تھا ۔ جس سے وہ چونکا تو رہے تھے لیکن جہانِ ادب میں مستقل جگہ نہیں بنا پا رہے تھے ۔ نتیجتاً وہ ہر افسانے کے ساتھ تجزیہ، مضامین اور تشریح کی اشاعت ضروری تصور کرتے تھے ۔ لیکن ان سب کے باوجود انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا ۔" پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان تمام حقائق اور مسائل کو ذہن میں رکھ کر اردو کے جدید افسانہ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے مضمون "نیا افسانہ : روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحۂ فکریہ" میں علامتی اور استعاراتی انداز کو مستحسن نگاہوں سے دیکھا ہے ۔ لیکن اس ضمن میں صرف قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، عبداللہ حسین جیسے چند ہی افسانہ نگاروں کو اہمیت

دی ہے۔ ۱۹۸۰ میں انہوں نے جو پیش گوئی مختلف طریقے سے کی تھی کہ افسانہ کو علامتی اور استعاراتی اسلوب بہت دلوں تک سنبھالا نہ دے سکے گا۔ یا یہ کہ افسانہ کو بہر طور زمین پر پیر ٹکانے پڑتے ہیں یا کہ افسانہ کو زمان و مکان میں سانس لینا ہی پڑتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد واقعتاً اردو افسانہ میں وہ اوصاف و کمال واپس آتے گئے۔ جن کی بنا پر اسے لعنت ملامت کیا گیا تھا یا جس کے برتنے والے سابقہ افسانہ نگاروں کو بے رحمی کے ساتھ رد کیا گیا تھا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس ضمن میں بے حد اہم رائے دی ہے۔

> " جو بات تشویشناک ہے وہ اوسط درجے کی ذہینت (MEDIOCRITY) یلغار ہے۔ جس کے باعث علامتی اور تمثیلی کہانی کے مقلدین کی تعداد اتنی بڑھی کہ ان کے ہاتھوں اس کہانی کے مستقبل کو شدید خطرہ درپیش ہے۔ اب علامتی تمثیلی کہانی بھی ایک فیشن اور فارمولا بن گئی ہے اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے اسے رواجاً اختیار کر رکھا ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی تخلیقیت اور نئی کہانی دونوں کو نقصان پہنچا ہے۔" [۱]

---

[۱] اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۴۷

افسانہ کی تنقید کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اردو افسانہ کے روایتی سرمایہ کو رد نہیں کرتے جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی کے یہاں ہم دیکھتے ہیں۔ فاروقی افسانے کی کسی روایت کو نہیں مانتے۔ فاروقی نے لکھا ہے کہ ......

> "اردو افسانے کی جس نام نہاد روایت کی پاسداری قمر رئیس صاحب اور ان کے ہم نواؤں یعنی ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر محمد عقیل کی طرف سے ہو رہی ہے وہ اردو افسانہ تو کیا، مغربی افسانے کی بھی روایت نہیں ہے"۔[1]

شمس الرحمٰن فاروقی کے برعکس پروفیسر گوپی چند نارنگ نے واضح الفاظ میں افسانے کی روایت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "یہ یاد رہنا چاہیئے کہ ادب میں کتنی ہی اور کیسی تبدیلیاں کیوں نہ آئیں۔ ادب کا گہرا رشتہ ہمارے اجتماعی لاشعور کے صدیوں پرانے تقاضوں، نسلی اثرات اور تہذیبی مزاج و افتادِ طبع

---

[1] افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش۔ از شمس الرحمٰن فاروقی۔ مشمولہ۔ نیا اردو دنیا افسانہ۔ مرتبہ۔ گوپی چند نارنگ ص ۲۷

سے ضرور ہوگا۔ چنانچہ ایک ایسے معاشرے میں جو پنچ تنتر اور کتھا سرت ساگر کی دھرتی سے تعلق رکھتا ہو اور جس کی ذہنی تشکیل میں الف لیلیٰ، طلسم ہوشربا اور حکایات گلستاں کا حصہ بھی رہا ہو۔۔۔۔۔ اس میں کہانی کتنی ہی نئی کیوں نہ ہو جائے وہ کہانی پن سے کلیتاً دامن کیسے چھڑا سکتی ہے۔ ایسا کرنے سے خدشہ ہے کہ خود کہانی کو نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اردو میں اس وقت یہی ہو رہا ہے۔" ۱؎

افسانہ کی تنقید کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہ افسانہ کے کسی رجحان یا روّیہ پر گفتگو کرتے ہوئے عمومی طور پر لئے جانے والے "ناموں" کا یا عرف عام میں ذکر کئے جانے والے ان کے مخصوص افسانوں کا تقلیدی طور پر ذکر نہیں کرتے بلکہ انہیں افسانوں کا ذکر کرتے ہیں جو واقعی عمدہ افسانے ہوتے ہیں خواہ ان افسانوں کا تعلق ترقی پسندی جدیدیت یا کسی اور رجحان سے کیوں نہ ہو۔ علامتی اور تمثیلی کہانیوں کو بھی وہ کہانی کی ارتقائی صورتیں مانتے ہیں لیکن اس پر اصرار کرتے ہیں

۱؎ اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۵۰۔ ۴۴۹

کہ کہانی میں کہانی پن کا ہونا بہرحال ضروری ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس غیر جانبدارانہ تنقیدی رویّے کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

"اس دور کی کسی اہم کہانی کو لیجئے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے خواہ وہ قرۃ العین حیدر کی "ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی" ہو یا "انتظار حسین کی کایا کلپ" مین را کی "وہ" سریندر پرکاش "بدوشک موت" انور سجاد کی "کونپل" جوگندر پال کی "رسائی" خالدہ اصغر کی "سواری" یا بلراج کومل کی "کنواں" تو ایسی تمام کہانیوں میں یہ خوبی ملے گی کہ یہ علامتی و تمثیلی کہانی کے اعلیٰ ترین تخلیقی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں اور ان میں بنیادی کہانی پن بھی ہے یعنی ان میں اپنی صنف بیانیہ کی پہچان بھی ہے ان کہانیوں کو قطع نظر ان کے استعاراتی یا تمثیلی نظام یا تخلیقی معنویت کے، ایک عام کہانی کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن کتنی نئی کہانیاں اس معیار پر پوری اترتی

ہیں۔ میرے نزدیک کہانی سے کہانی پن کا اخراج غیر افسانوی
عمل ہے اور اس کی مذمت کرنی چاہیئے۔" ع۱

کہانی کے کہانی پن کا علامتی اور تمثیلی کہانی۔ سے رشتہ جوڑتے ہوئے۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں یہ کہیں کہ روایتی افسانے کا جدید افسانہ سے ارتقاء کا رشتہ قائم کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ نے ۱۹۸۷ء کے افسانہ سیمنار میں یہ اضافہ بھی کیا کہ

"اردو میں پریم چند سے لے کر منٹو اور پھر بیدی تک حقیقت نگاری میں کچھ ایسی سطحیں تھیں جن سے علامتی مفاہیم کا اکھوا پھوٹ سکتا تھا۔ لیکن باقاعدہ علامتی کہانی کا آغاز ۶۰ - ۱۹۵۵ کے لگ بھگ پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد اور ہندوستان میں بلراج مین را اور سریندر پرکاش کی نسل سے ہوا۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے افسانہ نگار اُٹھے اور دیکھتے دیکھتے اردو افسانے کے زمین و آسمان بدل گئے۔ نئی کہانی

ع۱ اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل۔ مرتبہ گوپی چند نارنگ ص ۱۸۷

کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصوّر تھا یعنی حقیقت صرف وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو اسماء و اشکال کی دنیا سے پرے حواس سے اوجھل رہتی ہے اور جسے لفظ کو محض نشان کے طور پر استعمال کرنے سے نہیں بلکہ لفظ کو استعارے اور علامت کے طور پر استعمال کرنے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ کہانی صرف شعوری یا منطقی رشتوں کا نام نہیں۔ اس میں لاشعور کی کارفرمائیوں کا بھی عمل دخل ہے..... نئی کہانی نے اپنی سب سے بنیادی پہچان تصورِ حقیقت اور اظہار کے پیرایوں میں تبدیلی سے کرائی۔ یعنی لفظ محض لفظ نہیں تھے بلکہ ایسے استعاروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے لگے جن کے مفاہیم کو منطقی طور پر PARAPHRASE کرنا ممکن نہیں۔ فرد کی فردیت۔ اس کے معمولی پن میں اس کی UNIQUENESS، چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ

اور بنیادی صداقتیں، یعنی زندگی کی نوعیت اور ماہیت، خوشی اور غم کی حقیقت، وجود کا اختیار اور جبر و جنس کی سچائی عرفانِ ذات کی دہشت، نیز طرح طرح کے موضوعات کی رنگارنگی کہانی کی دنیا میں اپنی کیفیت دکھانے لگی۔ کہانی کی قدر شناسی کی سطح پر بڑی تبدیلی یہ آئی کہ موضوع سے چونکہ ادب کی تشکیل نہیں ہوتی۔ اس لیے موضوع اور اظہار کا پیکر سے مل کر جو تخلیقی وحدت وجود میں آتی ہے وہ افسانہ ہے۔" ۱ے

افسانہ کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری ان کے وسیع مطالعہ، باریک بینی، تجزیاتی شعور، غیر جانبداری اور اسلوب بیان وغیرہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عہد حاضر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو افسانہ کے سب سے بڑے نبض شناس اور سب سے بڑے نقاد ہیں۔

۱ے نیا افسانہ۔ علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر۔ نارنگ مشمولہ۔ نیا اردو افسانہ ص ۴۵

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی فن کارشناسی

منتخب تخلیقی فن کاروں کے حوالے سے

فن شناسی کی طرح فن کارشناسی بھی "تنقید" کا ہی ایک زاویہ، ایک رُخ ہے۔ لیکن ایک ذرا سے فرق کے ساتھ۔ فن کی تنقید یا فن شناسی کے لیے ضروری ہے کہ تنقید نگار اس فن کی تاریخ، روایات، اقدار اور تقاضوں کے تمام پہلوؤں کی گہری واقفیت رکھتا ہو۔ فن پارے کے فنی اور جمالیاتی دروبست، مضمرات اور امکانات کا شعور رکھتا ہو۔

لیکن فن کارشناسی کے لیے کسی فنکار کی شخصیت، ماحول، عہد اور سماجی و ثقافتی حالات، نظریات اور تصورات وغیرہ کا تو جائزہ لینا ہی پڑتا ہے اس فنکار کی تمام تر تصنیفات اور اسکے ہم عصر فنکاروں کی تخلیقات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو فن کارشناسی۔ فن شناسی سے کہیں زیادہ دشوار اور ذمہ دارانہ عمل ہے جس کے لیے تنقید نگار کو فن کار کے حالات و کوائف کے علاوہ اس کے فن پاروں کے محرکات اور انسلاکات کی بھی تمام تہوں اور طرفوں کو کھول کر دیکھنا ہوتا ہے۔ اس طرح فن شناسی کے مقابلے

میں فن کارشناسی کہیں زیادہ مشکل تنقیدی عمل ہے۔ اسی لیے اردو تنقید میں غزل یا نظم، افسانہ یا ناول وغیرہ شعری اور نثری اصناف کے حوالے سے تو بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن اردو کی مختلف اصناف کے امکانات کی توسیع میں کس فن کار نے کون سا کردار ادا کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے کون سے نادر حربے اور غیر معمولی تخلیقی رویے اپنا کر اپنے فن کو کتنا منفرد کتنا عظیم اور یادگار بنایا ہے۔ ان باتوں کا تنقیدی جائزہ لینا آسان نہیں۔ اسی لیے اردو میں' میر کا غم' غالب کی خودداری' اقبال کی مشرقیت' پریم چند کی حقیقت نگاری' بیدی کے افسانوں میں پنجاب کی عکاسی' منٹو کی نفسیات نگاری جیسے عنوانات کے حوالے سے فن کارشناسی کے نام پر متاثراتی مضامین تو ہیں تنقیدی مضامین کم ہی ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فن کارشناسی کے حوالے سے تنقید نگاری کے نئے ابعاد 'DIMENTIONS' قائم کیے ہیں۔ امیر خسرو' میر تقی میر' غالب اور اقبال جیسے عظیم شاعروں کی حقیقی تخلیقی شناخت اور فنکارانہ مقام متعین کرنے میں انہوں نے فنکارشناسی کے نئے ابواب قائم کیے ہیں اسی طرح افسانہ کے حوالے سے پروفیسر نارنگ نے پریم چند

راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر سے لے کر انتظار حسین اور جدید ترین افسانہ نگاروں تک کے فنی امتیازات اور مقامات کی تعیّن میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہاں فنکار شناسی کے حوالے سے ان تمام فن کاروں کے بارے میں، جن کا تنقیدی جائزہ پروفیسر نارنگ نے پیش کیا ہے، ذکر ممکن نہیں پھر بھی اختصار کے ساتھ چند ایک تخلیقی فنکاروں کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کی فنکار شناسی کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

• امیر خسرو

امیر خسرو کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی تصنیف "امیر خسرو کی ہندوی شاعری" میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری" میں بھی امیر خسرو کے امتیاز و انفراد پر روشنی ڈالی ہے۔ خسرو شناسی کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے امیر خسرو کے بارے میں جو اہم تنقیدی خیالات ظاہر کئے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

۱۔ امیر خسرو "ہندوی" (قدیم اردو ہندی) کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے

اپنے ہندوستانی ہونے پر خصوصیت کے ساتھ فخر و ناز کیا ہے۔ بقول خود ہندوستان ان کی جائے پیدائش، ان کی پناہ اور ان کا وطن تھا۔

ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن

"نہ سپہر" اور "قرآن السعدین" ان کی تاریخی مثنویوں میں خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان میں انہوں نے متعدد اشعار میں اپنے ہندوستانی ہونے کا ذکر کیا ہے اور اپنی جنم بھومی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اسے اپنے آبا و اجداد کے وطن بلخ و بخارا اور ماوراء النہر وغیرہ پر ترجیح دی ہے۔ "نہ سپہر" کے نو ابواب میں سے ایک مکمل باب ہندوستان سے متعلق ہے۔ اس میں ہندوستان کے پھلوں اور پھولوں کی خوبی اور لطافت اور یہاں کی آب و ہوا کی تعریف کی گئی ہے۔ ہندوستان کے باشندوں کا حسن و جمال، ان کی خداداد ذہانت اور بالخصوص دوسری زبانوں کو بہ آسانی سیکھ لینے کی صلاحیت، علوم و فنون میں ان کی قابلیت اور مہارت غرض یہ کہ اس کی دینی اخلاقی اور سماجی زندگی کا ایسا کوئی پہلو نہیں۔ جسے انہوں نے نہ سراہا ہو اور جس کی بنا پر انہوں نے اسے غیر ملکوں کے مقابلے میں ترجیح کا مستحق نہ ٹھہرایا ہو۔[1]

---

[1] ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔ از گوپی چند نارنگ ص ۲۴۰

۲۔ "مثنوی نہ سپہر کا تیسرا باب جو ہندوستان کی تعریف میں ہے۔ اس میں چار پانچ سو اشعار ہیں ایک جگہ اپنی پدری زبان ترکی اور فارسی پر ہندوی کو ترجیح دی ہے۔

اثبات گفت ہند بہ حجت کہ راجح است
بر پارسی و ترکی از الفاظ خوشگوار[۱]

۳۔ " اپنے چوتھے اور سب سے اہم دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں اپنے ہندوستانی ترک ہونے پر فخر کیا ہے اور کہا ہے کہ میں ہندوی روانی سے بول سکتا ہوں۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

اسی دیباچے میں "طوطی ہند" کی رعایت سے اپنی ہندوی گوئی کی بھی داد چاہی ہے۔

چو من طوطی ہندم از راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

---

[۱] ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔ از گوپی چند نارنگ ص ۲۴۱

دراصل خسرو شناسی کے حوالے سے خسرو کی شاعری کے امتیازات پر اردو کے اکثر و بیشتر ناقدین نے اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن خسرو کی ہندوستان دوستی اور حب الوطنی کا تنقیدی جائزہ تفصیل کے ساتھ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہی پیش کیا ہے۔

فن کار شناسی کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کا ایک اہم کارنامہ ان کی تصنیف "اسلوبیات میرؔ" ہے۔ دراصل یہ تحریر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خطبہ ہے جو انہوں نے انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام منعقد کروائے جانے والے "بابائے اردو یادگاری خطبات" کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجمن کی درخواست پر یہ خطبہ اپریل ۱۹۸۴ء میں کراچی اور لاہور میں دیا تھا۔ اس خطبے کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

ظاہر ہے کہ میر شناسی کے حوالے سے، خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر حامدی کاشمیری، جمیل جالبی، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ متعدد ناقدین نے اپنی تحقیقی و تنقیدی تصنیفات پیش کی ہیں۔ ان ساری تصنیفات کی اپنی اپنی جگہ بے حد اہمیت ہے۔ ان کے مطالعے کے بغیر میر تقی میرؔ کی فن کارانہ عظمت اور

انفرادیت کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ لیکن ان تمام تصنیفات میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تصنیف "اسلوبیاتِ میر" کی ایک منفرد حیثیت اس وجہ سے ہے کہ اس میں پروفیسر نارنگ نے میرؔ کے ان تمام امتیازات کی نشاندہی کر دی ہے جن امتیازات کو بنیاد بنا کر دوسروں نے میرؔ کے حوالے سے ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔

اسلوبیاتِ میرؔ صرف ۸۵ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مقالہ ہے۔ لیکن اس مختصر مقالہ میں پروفیسر نارنگ نے فن کار شناسی کے جو اعلیٰ تنقیدی نمونے پیش کئے ہیں ان کی بنا پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ

مختصر کہہ کے رجھانے کا ہے انداز جدا

پروفیسر نارنگ نے اس مقالے کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے میں الگ الگ عنوانات قائم کر کے میر کے شاعرانہ انفراد کے الگ نکات سے بحث کی ہے۔ یوں تو پورا مقالہ ہی قابلِ غور و فکر ہے۔ ہر عنوان کے تحت میر کی شاعرانہ فن کاری کے کسی نہ کسی نئے پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے اس لیے اگر اہم اور منتخب اقتباسات نقل کئے جائیں اور ان کی تنقیدی خوبیوں سے بحث کی جائے تو ایک الگ مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہاں میرؔ کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کی اس تصنیف سے چند اقتباسات ہی پیش کرنے

پر اکتفا کیا جائے گا۔

۱۔ "شروع ہی سے میر کا مزاج اپنے پیشروؤں سے بالکل مختلف تھا۔ ان کا جوہر ذاتی اس نوع کا تھا اور تخلیقی اُپج ایسی زبردست تھی کہ شروع جوانی ہی سے میر اپنے عہد کے مزاج سے ہٹ کر شعر کہہ سکتے تھے اور اپنی طرز گفتار اور انفرادی لہجے کا انہیں شدید احساس بھی تھا ورنہ سودا جیسے مسلم الثبوت شاعر کے مطلع پر بدیہہ مطلع کہنے کی ہمت کیونکر کرتے نوجوانی کی اس ایک بیت سے کئی ایسے عناصر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو بعد میں میر کے شعری اسلوب اور طرز گفتار کی شناخت بن گئے۔" [۱]

۲۔ "میر اردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں جن کے یہاں اردو کی جتنی شانیں، جتنے ذیلی اسالیب اور جتنی لسانی جہتیں ملتی ہیں اتنی بعد کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔ غالب اور اقبال کی عظمت مسلّم، لیکن غالب یا اقبال کے شعری اسالیب میں اتنا لسانی تنوع نہیں ہے۔ تاریخ کے

---

[۱] اسلوبیاتِ میر۔ از پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۹

لمحات میں رائج ہونے والے مختلف اسالیب کے مختلف دھاروں کے باہم موج زن ہونے سے جو کیفیت میر کے یہاں پیدا ہوتی ہے۔ بعد میں وہ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اقبال کے شعری اور معنیاتی اسلوب کا جو رشتہ غالب سے ہے وہی رشتہ غالب کے شعری اسلوب کا میر سے ہے۔ غالب کی بہار ایجادی بیدل' اپنی جگہ پر لیکن مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح وضاحت کی ہے کہ غالب کے شعری اسلوب کے اکثر حوالے میر سے نکلتے ہیں۔ میر کے یہاں شعری زبان کی وہ کیفیت بھی موجود ہے جو گنجینۂ معنی کی طلسم کاری سے عبارت ہے۔ جسے منتہائے کمال کو پہنچا دیا اور سلاست والی شان سے ہوتی رہی ہے جو تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔"[1]

ایک اور مقام پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے حرفِ عام میں مشہور میر

---

1. اسلوبیات میر۔ از پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۱۴

کی سادہ بیانی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میرؔ کے سلسلے میں سہل ممتنع کا تذکرہ سب نے کیا ہے۔ غالبؔ نے اپنے ایک خط میں سہل ممتنع کی دادیوں دی ہے کہ جس کو دیکھ کر خیال ہو کہ ایسا کہنا بہت آسان ہے۔ لیکن جب کہنے کی کوشش کی جائے تو ناممکن ہو۔ اس سہل ممتنع کا اسلوبیاتی پہلو یہ ہے کہ میرؔ کے اشعار میں حیرت انگیز حد تک عام بول چال یا نثر کی نحوی ترتیب برقرار رہتی ہے..... میر کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں اگرچہ کہیں کہیں ضرورتِ شعری کے تحت ایک آدھ لفظ آگے پیچھے آتا ہے لیکن جس بڑے پیمانے پر زبان کی عام ساخت یعنی جملے کی ساخت برقرار رہتی ہے۔ ان کی قدرت کلام کا کھُلا ہوا ثبوت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اکثر کے اشعار میں یہ بھی دیکھئے کہ دو مصرعوں میں دو NODES کا وقوع فطری ہے۔ اگر مصرعے نحوی طور پر مربوط ہوں یعنی ایک میں خبر ہو اور دوسرے میں

مبتدا تو NODE ایک ہی ہوگا۔ لیکن میرؔ کے یہاں اکثر و بیشتر تین یا اس سے زیادہ NODES ملتے ہیں یہ بالذات نحوی واحدے اور ان کی فطری ساخت سہل ممتنع کی وہ اسلوبیاتی بنیاد ہے جس کی وضاحت شعریات کی قدیم روایت میں ناممکن تھی جیسا کہ مولوی عبدالحق نے بھی اعتراف کیا ہے "میر کا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع کا تجزیہ کر کے الگ الگ اس کی خوبیوں کا گنوانا ناممکن ہے"[ع۱]

پروفیسر نارنگ نے ایک نئے اسلوبیاتی زاویئے سے میر کی شاعرانہ انفرادیت کو اُجاگر کیا ہے۔ اسی طرح میر کے بارے میں ایک عام رائے یہ قائم کرلی گئی ہے کہ میرؔ کی شاعری عام بول چال" کی شاعری ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر نارنگ نے میرؔ کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

ع۱ اسلوبیاتِ میر۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ ص ۲۶-۲۷

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

اور پھر لکھا ہے۔

"میر کے یہاں اگر "بول چال کی زبان" ہے اور کوئی خاص "طرز" بھی نہیں تو پھر موتی پرونے کا راز کیا ہے؟ یہ سوال شعری زبان کے جن امکانات پر توجہ کی دعوت دیتا ہے ان میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ بول چال کی زبان شاعری کی زبان نہیں ہوتی لیکن شاعری کی زبان میں بول چال ہو سکتی ہے اور اس کا حق ادا کرنا سلیقہ شاعری پر موقوف ہے۔ میر کا اصل کارنامہ جو بالعموم فریب نظر کی کیفیت پیدا کرتا ہے یہ ہے کہ انہوں نے لہجہ عام کو اپنایا لیکن اسے لہجہ عام کی سطح پر برتا نہیں۔ بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ بول چال کی زبان میں۔ زبان کی محض اوپری ساخت کام کرتی ہے۔ اس میں لفظ محض لفظوں کی طرح کام کرتے ہیں اور

صرف وہی معنی ادا کرتے ہیں۔ جو ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔
بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان کا یہ بنیادی فرق کہ
بول چال کی زبان صرف اپنی اوپری ساخت کے ذریعے
کام کرتی ہے دوررس نتائج کا حامل ہے کیونکہ شاعری
کی زبان میں زبان کی محض اوپری ساخت نہیں بلکہ اس کے
علاوہ داخلی ساخت اور بعض اوقات کئی کئی داخلی ساختیں
کام کرتی ہیں "۔[۱]

اقبال۔

علامہ اقبال پر اتنا زیادہ لکھا جا چکا ہے کہ بڑے ناقدین عام طور پر اقبال پر کم ہی لکھتے ہیں چنانچہ شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، پروفیسر وہاب اشرفی وغیرہ کی طرح پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی اقبال پر کم ہی لکھا ہے۔ لیکن جو چند ایک تنقیدی تحریریں انہوں نے اقبال کے حوالے سے قلم بند کی ہیں وہ بھی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ اقبال کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کا ایک مشہور مقالہ "اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام" ہے۔ اس مقالے میں پروفیسر نارنگ نے اقبال کی بعض چنندہ نظموں کا صوتیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان

---

[۱] ۔ اسلوبیات میر۔ از پروفیسر گوپی چند نارنگ ۔ ص ۳۵

نظموں میں اقبال کے ابتدائی دور کی نظم " ایک شام " کے علاوہ اقبال کی بعض مشہور نظموں مثلاً "مسجد قرطبہ"، "ذوق و شوق"، "طلوع اسلام"، "لینن خدا کے حضور میں" وغیرہ کا صوتی تجزیہ کرتے ہوئے معکوسی، صفیری اور ہکاری آوازوں والے الفاظ اور تراکیب کے استعمال میں فن کاری کے استعمال سے موازنہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

" ان تینوں شاعروں کے یہاں طویل مصوتوں کے استعمال کی جو تصویر مرتب ہوتی ہے وہ یوں ہے ۔

میرؔ — ۱۶ - طویل مصوتے فی شعر

غالبؔ — ۱۱ - طویل مصوتے فی شعر

اقبالؔ — ۱۶ - طویل مصوتے فی شعر

اس تقابلی تجزیئے سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ طویل مصوتوں کے معاملے میں اقبالؔ، غالبؔ سے خاصے آگے ہیں اور میرؔ کے ہم پلہ ہیں ۔ اتنی بات واضح ہے کہ جہاں طویل مصوتوں کی فراوانی ہوگی، غنائی مصوتوں کی کثرت بھی وہیں ہوگی ۔ کیونکہ اردو کا ایک

عام رجحان ہے کہ غنیّت صرف طویل مصوتوں کے ساتھ ہی وارد ہوتی ہے۔ نغمگی کے لیے طویل مصوتوں کے ساتھ ساتھ غنائی مصوتوں کی جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اقبال کا کمال جس نے ان کے صوتیاتی آہنگ کو اردو شعریات کا عجوبہ بنا دیا ہے دراصل یہ ہے کہ طویل و غنائی مصوتوں کی زیریں کیفیات اقبالؔ کے یہاں زناٹے دار صفیری و سلسلہ وار "مسلسل آوازوں کی آسمانی کیفیات کے ساتھ مربوط و مخروج ہو کر سامنے آتی ہیں۔ اقبالؔ کے یہاں صفیری و مسلسل آوازوں اور طویل و غنائی مصوتوں کا یہ ربط و امتزاج ایک ایسی صوتیاتی سطح پیش کرتا ہے جس کی دوسری نظیر اردو میں نہیں ملتی۔ اصوات کی اس خوش امتزاجی نے اقبالؔ کے صوتیاتی آہنگ کو ایسی دلآویزی، توانائی شکوہ اور آفاق میں سلسلہ در سلسلہ پھیلنے والی ایسی گونج عطا کی ہے جو اپنے تحرّک و تموّج اور

اُمنگ و ولولے کے اعتبار سے بجا طور پر یزداں گیر کہی جا سکتی ہے۔"[۱۶]

فن کارشناسی کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے وہ مضامین بے حد اہم ہیں جو انہوں نے اردو کے نمائندہ افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے فنی امتیازات اور شناختی خصائص کے بارے میں لکھے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر پریم چند، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلراج مین را، سریندر پرکاش، انتظار حسین پر ان کے مضامین ایک طرف تو فن کارشناسی کے نئے معائر قائم کرتے ہیں دوسری جانب اردو فکشن اور فکشن کی تنقید کو نئے امکانات اور جہات بھی بخشتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مذکورہ بالا فن کاروں کے فن سے متعلق ایسے ایسے نادر و نادیدہ نکات کی نشاندہی کی ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ فن کارشناسی کے حوالے سے ان کے مضامین کے کن اقتباسات کو نقل کیا جائے اور کن اقتباسات کو چھوڑا جائے لیکن ایک اور سچائی یہ بھی ہے کہ اقتباسات چاہے جہاں سے کیوں نہ نقل کئے

---

[۱۶] اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام۔ از پروفیسر نارنگ
مشمولہ۔ اقبال کا فن۔ مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص ۸۴-۱۸۳

جائیں۔ فن کارشناسی نئے سنگ ہائے میل سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر پریم چند کے بارے میں سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن جب پروفیسر گوپی چند نارنگ بحیثیت فن کار پریم چند کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ایسے نادرالوجود نکات سامنے لاتے ہیں۔

۱۔ "پریم چند کی شخصیت اور ان کے فن کو ان کی ابتدائی تربیت
تصنیف و تالیف کے اردو پس منظر اور اردو زبان کے
شعوری اور غیر شعوری اثرات کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔
اسی طرح ہندی کی طرف ان کا جو جھکاؤ ہوا اور اپنے
تخلیقی اظہار کے لیے بعد میں انہوں نے جس طرح ہندی
کو اختیار کیا تو لامحالہ اردو میں بھی پورے پریم چند کو
ان کے ہندی میلان و اظہار کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے
ابھی تک کوئی ایسا اعلیٰ تنقیدی کارنامہ نظر نہیں آتا جو
پریم چند کی اردو ہندی شخصیت سے پوری غیر جانبداری
اور علمی معروضیت کے ساتھ انصاف کرتا ہو۔ دوسرے
یہ کہ ایک زبان کے دائرے میں رہ کر پریم چند کے بارے

میں بنیادی امور تک پر اتفاق نہیں۔ ہندی والوں میں
اس بارے میں جو جھگڑے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا، اردو میں
جو صورت حال ہے وہ بھی کچھ کم افسوس ناک نہیں"۔ ع[۱]

۲۔ "...... پریم چند کے ایک قاری کی حیثیت سے یہ دیکھ کر
دکھ ہوتا ہے کہ پریم چند کی ذات، شخصیت اور فن کی
افہام و تفہیم طرح طرح کے سیاسی، نیم سیاسی، مذہبی،
سماجی اور لسانی تعصب کا شکار رہے اور ان تعصبات
کو بجائے کم کرنے کے روز بروز اور بھڑکایا جاتا ہے۔
فن کار پریم چند کیا تھے کیا نہیں تھے۔ اس بات کو یاروں
نے زیادہ تر فراموش کر دیا اور زور بیان صرف ہوتا ہے
تو اس پر کہ ان کی سیاسی، نظریاتی اور مذہبی وابستگی کیا
تھی؟۔ یعنی سیاسی پریم چند اور مصلح پریم چند تخلیقی پریم چند
سے زیادہ اہم قرار پا چکے ہیں۔ قدرتی طور پر ایسی بحثوں میں

ع[۱] افسانہ نگار پریم چند (تکنیک میں **IRONY** کا استعمال) از گوپی چند نارنگ
مشمولہ اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۶۳-۱۶۲

پریم چند کے دیباچوں، ان کے خطوط، مضامین اور بیانات
سے زیادہ سے زیادہ مدد لی جاتی ہے۔ اور پریم چند کی
تخلیقات سے کم سے کم۔" [۱]

پریم چند کے افسانوں کفن، سوا سیر گیہوں، عیدگاہ، جرمانہ، دودھ کی قیمت، دو بیلوں کی کہانی، شطرنج کے کھلاڑی اور پوس کی رات وغیرہ کا نئے زاویوں سے تنقیدی جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

"پریم چند انسانی نفسیات کا شعور رکھتے تھے ان کے پاس صرف
ایک دردمند اور انسان دوست دل ہی نہیں، حقیقت
کو پہچاننے والی نظر اور اسے بیان کرنے والا قلم بھی تھا۔
سچا فن کار جس طرح حقیقت کی بازیافت کرتا ہے۔ تخیل
کی سطح پر اس سے جس طرح چراغ روشن کرتا ہے اور
گزراں حقیقت کی تقلیب کر کے اسے جس طرح فنکارانہ
چابکدستی سے تخلیقی سطح پر زندہ جاوید کر دیتا ہے۔ پریم چند
کے یہاں اس کی مثالوں کی کمی نہیں۔ وہ اخلاقیات اور

---

[۱] افسانہ نگار پریم چند۔ از گوپی چند نارنگ، مشمولہ۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۱۶۳

جذبات سے ہٹ کر بھی دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے حق و انصاف، عدل و شجاعت، دھرم کرم اور سماج سیوا کے جو آدرش تراشے ہیں۔ انہیں بعض جگہ اپنے ہی کرداروں کے ہاتھوں ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے بھی دکھایا ہے۔ اس کے لیے جس فن کارانہ ہمت اور بے دردی کی ضرورت ہے، وہ بھی ان میں تھی۔ انہوں نے بے لاگ حقیقت نگاری بھی کی۔ گہرے طنز سے بھی کام لیا اور نہایت سفاکی اور بے رحمی سے **IRONY** کی تعمیر و تشکیل کا حق بھی ادا کیا۔ تاہم ان کی ابتدائی اور بہت سی بعد کی کاوشوں کا غالب رجحان اخلاقی اور اصلاح پسندانہ ہے اس الزام سے پریم چند کس طرح بری قرار دیئے جاسکتے ہیں۔" [۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی فنکارشناسی کا غیر معمولی مظاہرہ راجندر سنگھ بیدی سے متعلق اپنے مقالے میں کیا ہے۔" بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری

[۱] افسانہ نگار۔ پریم چند۔ از گوپی چند نارنگ مشمولہ۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۱۸۱

جڑیں" کے عنوان سے انہوں نے "دانہ و دام" اور "گرہن" کی کہانیوں سے لے کر "اپنے دُکھ مجھے دے دو" لاجونتی، دیوالہ، لمبی لڑکی، ٹرمنس سے پرے وغیرہ شاہکار کہانیوں کے حوالے سے بیدی کے فن کے استعاراتی اور اساطیری پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ پروفیسر نارنگ کے مطابق بیدی کے ابتدائی افسانوں "رحمان کے جوتے" اور "اغوا" میں علامتی فضا تشکیل دینے کی کوشش ملتی ہے۔ لیکن

> "وہ کہانی جس میں بیدی نے استعاراتی انداز کو پہلی بار پوری طرح استعمال کیا ہے اور اساطیری فضا اُبھار کر پلاٹ کو اس کے ساتھ ساتھ تعمیر کیا ہے۔ "گرہن" ہے۔ اس میں ایک گرہن تو چاند کا ہے اور دوسرا گرہن اس زمینی چاند کا ہے جسے عرف عام میں عورت کہتے ہیں اور جسے مرد اپنی خودغرضی اور ہوسناکی کی وجہ سے ہمیشہ گہناتے کے درپے رہتا ہے۔ "ہولی" ایک نادار، بے بس اور مجبور عورت ہے۔ اس کی ساس "راہو" ہے اور اس کا شوہر "کیتو" جو ہر وقت اس کا خون چوسنے اور اپنا قرض وصول کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ہولی کی سسرال سے مائیکے

بھاگ نکلنے کی کوشش بھی گرہن سے چھوٹنے کی مثال ہے لیکن چاند گرہن سے سماجی جبر کا گرہن کہیں زیادہ اٹل ہے۔ ہولی گھر کے کیتو سے بچ نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو اسٹیمر لانچ کے کیتو کھتورام کی گرفت میں آجاتی جو اسے رات بھر کے لیے سرائے میں لے جاتا ہے اور اس طرح یہ خوبصورت چاند ایک گرہن سے دوسرے گرہن تک مسلسل عذاب کا شکار رہتا ہے اس کہانی کی معنویت کا راز یہی ہے کہ اس میں چاند گرہن اور اس سے متعلق اساطیری روایات کا استعمال اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ کہانی کی واقعیت میں ایک طرح کی مابعد الطبیعاتی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ خارجی حقیقت میں آفاقی حقیقت یا محدود میں لامحدود کی جھلک دیکھنے کی یہی خصوصیت جو گرہن میں ایک بیج کی حیثیت رکھتی ہے، آزادی کے بعد بیدی کی کہانیوں میں ایک مضبوط اور تناور درخت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے اور بیدی کے فن کی خصوصیت خاصہ بن جاتی

ہے اس سلسلے میں ان کی کہانی "اپنے دُکھ مجھے دے دو" اور ناول
"ایک چادر میلی سی" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بیدی کے
فن کی استعاراتی اور اساطیری بنیادوں کو سمجھنے کے لیے
ان دونوں کا نسبتاً تفصیلی تجزیہ کرنا اور الفاظ کے پردوں
کو ہٹا کر ان کے پیچھے کے معنوی رشتوں کا پتہ چلانا بہت
ضروری ہے"۔ [۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو افسانہ میں علامیت اور تجریدیت کے رجحانات کے حوالے سے مشہور جدید افسانہ نگاروں بلراج مین را، سریندر پرکاش اور انتظار حسین کے فن کا جائزہ بھی افسانہ کے وسیع روایات، عصری رجحانات اور پائیدار امکانات کے حوالے سے لیا ہے۔ اپنے مضمون "اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ ــ بلراج مین را اور سریندر پرکاش" میں اول تو انہوں نے بلراج مین را کے مشہور علامتی افسانہ "ماچس" کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے بڑی گہرائی کے ساتھ افسانہ کی علامتی فضا کی پرتیں کھولتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس کہانی کا بنیادی کردار یعنی "وہ" کون ہے اور ماچس

---

[۱] بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری بنیادیں۔ از گوپی چند نارنگ
مشمولہ۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۴۰۸-۴۰۷

ایسی کون سی پُراسرار چیز ہے جس کی تلاش میں وہ رات کی سردی اور اندھیرے میں مارا مارا پھر رہا ہے۔؟ فرض کیجئے کہانی کا بنیادی کردار جدید دور کا باشعور انسان ہے۔ ملاحظہ ہو کہ پکڑے جانے سے پہلے وہ راستے میں ایک آدمی سے ماچس مانگتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ سگریٹ پینے کی علّت سے بچا ہوا ہے نیز جب وہ تھانے سے نکل کر نہ ختم ہونے والی سڑک پر چلنا شروع کرتا ہے تو سوچتا ہے "سگریٹ پینا ایک علّت ہے۔ میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے۔ کیا یہ علّت جینے کی علّت تو نہیں۔؟ عام انسان اور باشعور انسان میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ باشعور یا حساس انسان سوچنے یا محسوس کرنے پر مجبور ہے۔ اب ماچس کی علامت افسانے کی دوسری علامتوں کے ڈھانچے (FRA-ME WORK) کے ساتھ خود بخود واضح ہونے لگتی ہے یعنی شاید یہ تلاش زندگی کی معنویت کی، یا ترتیب سے وجود کو سمجھ سکنے کی، یا کسی بھی مقصد یا آئیڈیل کو پانے کی،

جس کے لیے پورا وجود سُلگ رہا ہے۔ یا جس کے لیے انسان
جینے پر مجبور ہے۔ لیکن اِسی ماچس کے بارے میں حلوائی کی
دوکان پر سویا ہوا آدمی کہتا ہے۔ "ماچس سیٹھ کے پاس
ہوتی ہے۔ وہ آئے گا تو بھٹی گرم ہوگی" نیز یہ کہ تھانے
میں "میز پر ماچس کی کئی ڈبیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہاں حلوائی
یا تھانے کے لوگوں کی علامتوں سے ایسے انسان مراد لئے
جاسکتے ہیں جو ذہنی تجسّس کے اس مادے سے بیگانۂ محض
ہیں جو باشعور انسان کے حصے میں آتا ہے۔ یہ تخلیقی احساس
یا داخلی کرب یا جستجو کی دولت سے بھی محروم ہیں۔ اسلیے
ان کی ماچس سے افسانے کا بنیادی کردار سگریٹ سلگانے
میں کامیاب نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی اندھیری رات میں جگہ
جگہ بھٹکتا ہے لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ اس توجہ کی
توثیق کہانی کے آخری واقعے سے بھی ہوتی ہے جس نے
کہانی کو ایک عام علامتی سطح سے اُٹھا کر اعلیٰ ترین فنی سطح

پر پہنچا دیا ہے"۔ ؎۱

اسی طرح پروفیسر نارنگ نے مین را کے ایک اور مشہور افسانہ "کمپوزیشن دو" کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ دراصل کسی بھی فن کار کے فن پاروں کا اس انداز میں تجزیہ کر کے فن کارشناسی کے نئے معیار قائم کرنے کا سہرا پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہی سر ہے۔

اسی طرح پروفیسر نارنگ نے ایک اور ممتاز افسانہ نگار سریندر پرکاش کے افسانہ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" کو بنیاد بنا کر بحیثیت ایک علامتی و تجریدی افسانہ نگار کے سریندر پرکاش کا فنی مقام و مرتبہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل اس طرح کے تہہ دار علامتی افسانہ کی توضیح و تعبیر بے حد دشوار ہے پھر بھی پروفیسر نارنگ نے اس افسانہ کی ایک ایک علامت کی تہوں اور طرفوں کو کھول کر اور انہیں برتنے میں افسانہ نگار کی مہارت اور فن کاری کی نشاندہی کر کے سریندر پرکاش کو سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور کیا ہے۔

"سریندر پرکاش نے جدید انسان کے ذہنی مسائل کو اپنا نشانہ

؎۱ اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ۔ از گوپی چند نارنگ۔ مشمولہ اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۵۰۳

بنایا ہے۔ اس کی کہانیاں زبان و بیان کے ایجاز اور تہہ در تہہ علامتوں کی معنویت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ وہ بظاہر نہایت سادہ زبان استعمال کرتا ہے جیسے کوئی روانی سے بے تکلف لکھے چلا جاتا ہو۔ لیکن ہر سطر گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہے اور چند ہی جملوں کے بعد احساس ہونے لگتا ہے کہ پڑھنے والے کو ذہنی چیلنج کا سامنا ہے۔ سریندر پرکاش کے افسانوں کا تانا بانا خواب اور بیداری کے بیچ کی کیفیتوں سے تیار ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر چیزیں اپنے روایتی تصور سے ہٹ کر سامنے آتی ہیں اور پڑھنے والا چونک چونک اٹھتا ہے۔ نیم شعوری اور تحت الشعوری کیفیتوں کے امتزاج سے جا بجا تحیّر کے چھینٹے بھی ملتے ہیں جو کہانی کی دلچسپی بنائے رکھتے ہیں۔ سریندر پرکاش کے افسانوں میں لفظوں کے لغوی اور منطقی معنوں کے پیچھے ایک اور جہانِ معنی نظر آتا ہے۔ وہ استعاروں کے جال سے علامتی معنوں کی ایک وسیع اور روشن فضا قائم کر دیتا

ہے..... لغوی معنی سے پرے دیکھ سکنے والوں کے لیے
سریندر پرکاش کے افسانوں میں داستان کی سی واقعیت ہے
اور قصے کی سی کشش“ [1]

بلراج مین را اور سریندر پرکاش کے برعکس انتظار حسین کی شہرت تمثیلی اور اساطیری افسانہ نگار کے طور پر ہے۔ انتظار حسین کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے (۱) گلی کوچے (1951) (۲) کنکری (۱۹۵۷ء) (۳) آخری آدمی (۱۹۶۷ء) (۴) شہر افسوس (۱۹۷۲ء) اور (۵) کچھوے۔

فن کار کے طور پر انتظار حسین کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر نارنگ نے لکھا ہے کہ

”انتظار حسین اس عہد کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔
اپنے پرتاثیر تمثیلی اسلوب کے ذریعے انہوں نے اردو
افسانے کو نئے فنی اور معنیاتی امکانات سے آشنا کرایا
ہے اور اردو افسانے کا رشتہ بیک وقت داستان،
حکایت، مذہبی روایتوں، قدیم اساطیر اور دیومالا سے

---

[1] ۔ اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ۔ گوپی چند نارنگ۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۱۴-۵۱۳ ص ۵۳۶

ملا دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ناول اور افسانے کی مغربی ہیتوں
کی بہ نسبت داستانی انداز ہمارے اجتماعی لاشعور اور مزاج
کا کہیں زیادہ ساتھ دیتا ہے۔"

پروفیسر نارنگ کے خیال میں انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں" داستانوں کی فضا کو..... نئے احساس اور نئی آگہی کے ساتھ کچھ اس طرح برتا ہے کہ افسانے میں ایک نیا فلسفیانہ مزاج اور ایک نئی اساطیری داستانی جہت سامنے آگئی ہے۔ وہ فرد و سماج، حیات و کائنات اور وجود کی نوعیت و ماہیت کے مسائل کو رومانی نظر سے نہیں دیکھتے۔ نہ ہی ان کا رویہ محض عقلی ہوتا ہے بلکہ ان کے فن میں شعور و لاشعور دونوں کی کارفرمائی ملتی ہے اور ان کا نقطہ نظر بنیادی طور پر روحانی اور ذہنی ہے وہ انسان کے باطن میں سفر کرتے ہیں، نہاں خانۂ روح میں نقب لگاتے ہیں اور موجودہ دور کی افسردگی، بے دلی اور کشمکش کو تخلیقی لگن کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انتظار حسین کے تخلیقی رویّوں سے تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کے علاوہ ان کے افسانوں کے موضوعاتی تنوع پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن مختلف افسانوں کے تنقیدی تجزیئے پیش کرتے

ہوئے انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"ان کا بنیادی تجربہ چونکہ ہجرت کا تجربہ ہے اور ہجرت اور سفر لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں بالخصوص وجودی افسانوں میں سفر یا اپنی ذات کی تلاش ایک انتہائی معنی خیز **MOTIF** کا درجہ رکھتی ہے۔ "وہ جو کھوئے گئے" اور "شہرِ افسوس" کی بنیاد ہی سفر پر ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ "پرچھائیں" "ہڈیوں کا ڈھانچہ" "ہم سفر" "ٹانگیں" اور "کٹا ہوا ڈبہ" میں بھی سفر کلیدی **MOTIF** کا درجہ رکھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کہانیوں میں جگہ جگہ مکالموں اور صورت حال کے ذریعے، کرداروں کے احساسات اور ذہنی کیفیات کے ذریعے اور حکایتوں اور تمثیلوں کے ذریعے انتظار حسین نے معاشرے پر بھرپور تنقید کی ہے۔ ان کا لہجہ کہیں بھی مایوسی، المناکی یا درشتی کا نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے۔"

پروفیسر نارنگ نے جس طرح شاعروں میں میر پر لکھتے ہوئے اپنی تمام تر

ناقدانہ صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے۔ اسی طرح افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ توجہ مبذول کی ہے۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کے جتنے پہلو، یا جتنی جہتیں ہوسکتی ہیں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان سب کو مثالوں اور دلائل کے ساتھ کھول کر رکھ دیا ہے اردو تنقید میں خصوصاً افسانے کی تنقید میں فن کارشناسی کی اس سے عمدہ مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معاملہ فن شناسی کا ہو یا فن کارشناسی کا پروفیسر نارنگ کی تنقیدی بصیرت، طریقہ نقد اور توضیحی و تعبیری رویّوں کو سمجھنے کے لیے یوں تو چند ایک اقتباسات سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو پروفیسر نارنگ فن شناسی اور فن کارشناسی سے پورے طور پر مستفید اور لطف اندوز ہونے کے لیے پروفیسر نارنگ کی تنقیدی تحریروں کو پورے کا پورا پڑھنا ضروری ہے۔ پروفیسر نارنگ اردو کے واحد ایسے نقاد ہیں جن کی تنقید میں تخلیق کی ہی طرح قاری کو بصیرت و آگہی کے ساتھ ساتھ لطف و انبساط بخشنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ ***

●

باب پنجم

گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری

معاصرین کے نقطۂ نظر سے

یوں تو تنقید کے حوالے سے پروفیسر گوپی نارنگ کے ہم عصروں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس فہرست میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس ڈاکٹر وزیر آغا، حامدی کاشمیری، وہاب اشرفی اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے مستند ناقدین سے لے کر ابوالکلام قاسمی، قدوس جاوید اور شافع قدوائی جیسے قدرے نئے ناقدین بھی شامل ہیں۔ لیکن چونکہ شمس الرحمٰن فاروقی کو اردو دنیا میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا حریف تصور کیا جاتا ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری سے متعلق سب سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی کے خیالات کا ہی جائزہ لے لیا جائے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مضمون "گوپی چند نارنگ۔ میرا رقیب میرا دوست" میں براہ راست پروفیسر نارنگ ہی سے خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"پیارے گوپی چند نارنگ۔ دنیا مجھے اور آپ کو دوست سمجھتی

ہے۔لیکن کچھ لوگ ہمیں رقیب بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔
چلئے مجھے اس پر بھی کوئی خاص اعتراض نہیں۔کیونکہ ہم دونوں ہی عروس اردو کے عاشق و دلدادہ ہیں اور جب معشوق ایک ہو اور عاشق دو تو رقابت کے پہلو نکل ہی آتے ہیں''۔ [۱]

شمس الرحمٰن فاروقی نے پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے کئی باتیں کہی ہیں۔مثلاً۔

''مجھے آپ کی جو بات سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی تحریر کو پڑھ کر صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟۔کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔کن باتوں کی بنا پر آپ اسے اچھا یا خراب' کامیاب یا ناکام قرار دیتے ہیں۔اختلاف یا اتفاق اسی وقت تو ممکن ہے جب ہمیں معلوم ہو کہ بات کی جا رہی ہے مثال کے طور پر بعض معاصر شعرا اور ناول نگاروں کے بارے میں مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔بعض معاصر شعرا کے بارے میں میری

۱۔ دیدہ ور نقاد گوپی چند نارنگ۔مرتبہ۔ڈاکٹر شہزاد انجم ص : ۲۸

رائے کو آپ خاص طور پر غلط گردانتے ہیں۔" ۱؎

اوپر کے اقتباس میں فاروقی نے مبینہ رقابت کی وجہیں بیان کی ہیں لیکن پھر فاروقی۔ خود اپنی اور پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کی انفرادیت اور اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے اسی مضمون میں لکھتے ہیں۔

"..... یہی افتخار کیا کم ہے کہ ہم معاصر ادب کی افہام و تفہیم اور اس کی تعیّن قدر میں مصروف ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ اور میرؔ وغیرہ کے بارے میں تو ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ سکتا ہے۔ لیکن معاصر ادب کے بارے میں کوئی رائے رکھنا تنقید کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ اسی لیے کولرج نے کہا تھا کہ تنقید کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اس زمانے میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کی اچھائیوں کو واضح کیا جائے، کیونکہ نئی چیز کو برا یا خراب یا غلط کہہ دینا تو بہت آسان ہے۔ پرانے پیمانے بھی موجود ہیں۔ جن کو کھینچ تان کر نئی تحریر کے خلاف ثابت کیا جا سکتا ہے اور پھر نئی چیز کو خراب کہہ دینے میں کوئی خواہ نہیں کیونکہ اس بات

۱؎ دیدہ ور نقاد گوپی چند نارنگ۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر شہزاد انجم ص۔ ۲۹

کا امکان بہر حال زیادہ ہے کہ نئی چیز خراب یا غلط ہوگی۔
سب سے بڑی بات یہ کہ ہم (فاروقی اور نارنگ) اپنے
کو کلاسیکی روایت کا امین کہہ کر بہت آسانی سے نئی چیزوں
سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف نئی تحریر میں
خوبیاں ثابت کرنے کی کوشش ہی مخدوش عمل ہے بعض
اوقات تو وہ لوگ بھی ناراض ہونے لگتے ہیں جن کی تحریر
میں خوبیاں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ لہٰذا وہ نقاد
جو معاصر ادب کا مطالعہ کرنے سے جی نہیں چراتا بلکہ ہر طرح
اس میں مصروف و منہمک ہوتا ہے۔ ہماری تعریف اور
احترام کا مستحق ہے۔" [۱]

اس کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی نے پروفیسر نارنگ کی براہ راست تعریف کرتے ہوئے کہا ہے۔

"آپ کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے کلاسیکی ادب
کے علاوہ معاصر ادب کے بارے میں بھی، تنقید، تعارف
اور تجزیئے کا حق ادا کیا ہے..... استدلال اور وجدان

۱؎ دیدہ ور نقاد گوپی چند نارنگ مرتبہ ڈاکٹر شہزاد انجم صفحہ ۳۰-۲۹

کے نشانہ بنانے چلنے کی مثال آپ کے ان مضامین میں ملتی ہے جن میں آپ نے میر انیس، اقبال اور میر کی صوتی اور نحوی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ خاص کر میر انیس پر آپ کا مضمون معرکے کا ہے۔ اس میں آپ نے دبیر سے موازنہ کرکے دکھایا ہے کہ میر انیس کے یہاں نظم کی ترتیب اور آہنگ کی تعمیر بعض صوتی اور لسانی کارگزاریوں کی بنا پر مرزا دبیر سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں آپ نے پہلے وجدانی طور پر طے کیا کہ دبیر کے مقابلے میں انیس بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ پھر آپ نے دھندلا سا احساس کیا ہوگا کہ انیس کی بعض صوتی اور لسانی خصوصیات پھر آپ نے انیس و دبیر کا موازنہ کرکے دیکھا کہ آیا وہ خصوصیات دبیر کے یہاں بھی ہیں کہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ دبیر کے یہاں وہ باتیں نہیں ہیں۔ پھر آپ کا مضمون وجود میں آیا۔ اسی طرح اقبال کے بعض لسانی خواص کی طرف آپ نے جو اشارے کئے ہیں وہ وجدان اور رشتے ولطیف کے ذریعے استدلال تک پہنچتے ہیں۔[1]

---

[1] دیدہ ور نقاد گوپی چند نارنگ (مرتبہ) ڈاکٹر شہزاد انجم۔ ص ۳۱-۳۰

شمس الرحمٰن فاروقی نے گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کے ایک اور امتیاز کی نشاندہی کرتے ہوئے واضح لفظوں میں کہا ہے۔

"گوپی چند نارنگ! آپ میں ایک اور خوبی ہے۔ جو شاید مجھ میں اور آپ میں مشترک ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ ادب کا مطالعہ غیر مشروط ذہن سے کرتے ہیں، ادب سے یہ تقاضا نہیں کرتے کہ وہ آپ ہی کے معتقدات اور تصورات کی ترجمانی کرے۔ آپ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادب اپنی جگہ خود ایک سچائی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ سچائی اس فلسفیانہ یا اخلاقی نظام سے ہر جگہ اور ہر طرح ہم آہنگ ہو جسے نقاد خود مانتا اور قبول کرتا ہے۔ ادب کے ساتھ آپ کا PASSIONATE COMMITMENT یعنی انتہائی سچا گہرا اور بے لوث لگاؤ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال ہوں یا غالب، میر انیس ہوں یا آج کا کوئی نوجوان شاعر آپ ان سب کا مطالعہ یکساں خلوص و یقین کے ساتھ اور ذہن کی یکساں آزادی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ نقاد

ہی کیا جس کے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھلی نہ ہوں اور
جس کی شخصیت کے تمام گوشوں میں ادب کی محبت
خالصتاً ادب کی خاطر نہ ہو" ؎۱

گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے نہ تو رقیبانہ ہے نہ محض دوستانہ بلکہ خالص ناقدانہ ہے اور شاید پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے بارے میں اس سے زیادہ غیر جانبدارانہ اور ایماندارانہ رائے نہیں دی جا سکتی۔ لیکن پروفیسر نارنگ کی ادبی لسانی اور تنقیدی شخصیت اتنی بڑی ہے کہ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا معتبر نقاد ہوگا۔ جس نے پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے بارے میں اپنی رائے نہ دی ہوگی چنانچہ یہاں پروفیسر نارنگ کے چند ایک معاصر ناقدین کی رائیں ملاحظہ ہوں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اردو کے مستند نقاد، تاریخ نگار اور محقق ہیں۔ انہوں نے پروفیسر نارنگ کی لسانیاتی تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

؎۱ ۔ گوپی چند نارنگ۔ میرا رقیب۔ میرا دوست از شمس الرحمٰن فاروقی
مشمولہ دیدہ ور نقاد ص ۳۲-۳۱

"نارنگ صاحب ..... بیک وقت ممتاز نقاد اور محقق بھی ہیں اور ماہر لسانیات بھی۔ ان کی تالیف "املا نامہ" جس میں اردو املا کو جدید لسانی بنیادوں پر استوار کر کے نئے ترمیم شدہ املا کو اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لحاظ سے ایک اہم اور بنیادی کام ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف "کرخنداری اردو زبان" بھی لسانی نقطہ نظر سے خاص اہمیت کی حامل ہے اسی طرح ان کی ایک اور کتاب "اردو کی تعلیم کے لسانی پہلو" بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جس کے مطالعے سے نہ صرف ہم اردو کی تعلیم کے مسائل سے بلکہ جدید دور کے تقاضوں کی روشنی میں ان مسائل کے حل سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ لسانیات کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ بھی (جیسا کہ اعلان ہوا ہے۔) لسانی تجزیے کے نام سے عنقریب دہلی سے شائع ہونے والا ہے۔"[۱]

---

[۱] یہ کتاب کئی سال قبل شائع ہو چکی ہے۔

"زبان اور صوتیات نارنگ صاحب کی دلچسپی کا ایک اہم
موضوع ہے جس سے برصغیر پاک و ہند کے بہت کم
ماہر لسانیات واقفیت رکھتے ہیں۔" ؏۱

اسی طرح مشہور نقاد حامدی کاشمیری نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اسلوب تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

"جدید نقادوں کی صف میں گوپی چند نارنگ ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے فن کے جمالیاتی وجود کا ادراک کر کے اس کے ہیئتی عناصر جو اس کی وحدت پذیری کو متشکل کرتے ہیں کے تجزیہ و تحلیل پر توجہ کی اور اچھوتے اور وسیع نتائج کا استخراج کیا۔ ہیئتی نقادوں میں جو چیز انہیں امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ فن کے ہیئتی مطالعے کو محض تعین معنی کا پابند نہیں کرتے۔ بلکہ وسیع تر تناظر میں فنکار کے تخلیقی عمل کے تعلق سے اس کی شخصیت کے ذہنی، معاشرتی اور ماورائی ابعاد کا پتا لگاتے ہیں اور فن کی ایک سے زائد سطحوں

؏۱ نارنگ۔ زندہ النسان۔ از۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مشمولہ۔ دیدہ ور نقاد ص ۵۲

کو روشن کرتے ہیں۔"[۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو تنقید میں کن جہتوں کا اضافہ کیا اس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر حامدی کاشمیری نے مزید لکھا ہے۔

"گوپی چند نارنگ عصر حاضر کے ان چند فن شناس اور باریک بین نقادوں میں شامل ہیں، جنہوں نے فن کی ماہیئت، تفاعل اور مقصدیت کے حوالے سے جدید، صحیح اور متوازن ادبی نظریات کی وکالت کی ہے اور فن کو افادی دستاویز کا بدل قرار دینے کے مروجہ گمراہ کن نظریے کی تغلیط کی ہے۔ یہ ان کا اہم کارنامہ ہے لیکن وہ اسی پر قانع نہیں رہے مطالعے اور تجربے میں نئی توسیعات کے ساتھ ساتھ ان کی ادب شناسی کے رویوں میں ہمہ گیری، انفرادیت اور ٹھوس پن پیدا ہوتا گیا۔ چنانچہ وہ ہیئتی تنقید کے طریق کار کی نمایاں ہوتی ہوئی حد بندیوں کو عبور کرکے لسانیاتی مطالعے کے تحت اسلوبیات کے نئے، معروضی اور سائنسی

---

[۱] - گوپی چند نارنگ کا اسلوب تنقید۔ از حامدی کاشمیری۔ مشمولہ دیدہ ور نقاد ص ۵۲

طریق نقد سے وابستہ ہو گئے اس ضمن میں ان کے چند مطالعے
معاصر تنقید میں ایک اہم اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔" ۱۰

پروفیسر حامدی کاشمیری نے اپنے اسی مضمون میں پروفیسر نارنگ کے تنقیدی طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید لکھا ہے۔

"گوپی چند نارنگ فن پارے کا تمام و کمال سامنا کرتے ہیں اور
اپنی دقت نظر، بالیدہ ذوق، نکتہ سنجی اور لفظ شناسی سے
اس کے لسانی نظام میں پیوستہ تہ در تہ مضمر معنیات کو
بے نقاب کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ناقدانہ شعور
کی دو نمایاں خصوصیات آئینہ ہو جاتی ہیں۔ اول وہ فن پارہ
یا فنکاروں کے بارے میں عمومی بیانات سے قطعی اجتناب
کر کے، اختصاصی، تجزیاتی اور استدلالی مطالعات سے
سروکار رکھتے ہیں۔ دوم وہ فنکار کے بجائے فن پارے
پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں اور فن پارے کی اسلوبیاتی
اور لسانی خواص کے ترکیبی عمل سے ابھرنے والے متخالف

---

۱۰ گوپی چند نارنگ کا اسلوب تنقید۔ از حامدی کاشمیری، مشمولہ دیدہ ور نقاد ص ۵۲

تصورات و اقدار کے ربط باہمی کی تلاش و تحسین کرتے ہیں"۔[۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں اپنے غیر معمولی لسانیاتی و ساختیاتی علم و آگہی کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ کم و بیش پروفیسر نارنگ کے تمام اہم معاصر ناقدین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ان میں پروفیسر وہاب اشرفی بھی شامل ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔

> "دوسروں کے مقابلے میں گوپی چند نارنگ کا امتیاز یہی رہا ہے کہ ان کا لسانیاتی علم ان کی ہر قدم پر مدد کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساختیات اسکول کے سب سے اہم دیدہ ور نقاد کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے۔ میرے خیال میں یہ بحث نہیں اٹھانی چاہیے کہ سب سے پہلے "ساختیات" کی طرف کون متوجہ ہوا۔ اگر خون لگا کر شہیدوں میں نام گنوانے کی آرزو ہو تو تاریخ

۱۔ گوپی چند نارنگ کا اسلوب تنقید۔ از حامدی کاشمیری مشمولہ۔ دیدہ ور نقاد ص ۵۳

نارنگ سے آگے بھی جائے گی لیکن سچ یہ ہے کہ ان سے
پہلے لکھنے والے تمام و کمال اپنے موضوع سے آگاہ نہ تھے
پھر ان کی تحریر برسبیل تذکرہ کے زمرے میں آتی ہے۔ گوپی چند
نارنگ کا پہلا مضمون "ساختیات اور ادبی تنقید" "ماہ نو"
(پاکستان) کے جون ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوا، پھر
یہی مضمون 'شعر و حکمت' حیدر آباد میں بھی اشاعت پذیر ہوا
---- اس مضمون کے تین واضح حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اس
کی وضاحت کی گئی ہے کہ انسانی ذہن اعلام و اشیا اور
ان کے روابط کو کس طرح دیکھتا ہے اور ساختیات ان
کی توجیہہ کس طرح کرتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے
جیکب سن کے تصورات پیش کر کے ان کا تجزیہ کیا ہے
انہوں نے مزید ساختیاتی فکر کے اساسی پہلو پر روشنی
ڈالی ہے کہ ادب مصنف کے تخلیقی ذہن کا کارنامہ نہیں
یا ادب اظہار ذات نہیں، یا متن مصنف کے ذہن و شعور
کا زائیدہ نہیں یا ادب زندگی کی سچائیوں وغیرہ کا آئینہ نہیں

صاف یہ ہے کہ مصنف اپنا اظہار نہیں کرتا، کوئی تخلیق
خلا میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ مصنف روایت کے سرچشموں
سے فیضان حاصل کرتا ہے اور ثقافت اور زبان کی
لغت سے استفادہ کرتا ہے۔ جو ہمیشہ پہلے سے لکھی
ہوئی موجود ہے ۔۔۔۔ دوسرے حصے میں ساختیات کے
حوالے سے SEMIOLOGY کی دقیق بحثیں اٹھائی
گئی ہیں اور ساختیات اور لسانیات کے باہمی ربط کو
واضح کیا گیا ہے..... اور تیسرا حصہ سوسئیر کے بنیادی تصورات
کی تفہیم سے متعلق ہے۔"[۱]

پروفیسر وہاب اشرفی نے ساختیات کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کی نمائندہ تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے، پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے ساختیاتی امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ

"نارنگ کے دو بے حد اہم مضامین ....."شعریات اور ساختیات"
مطبوعہ دریافت کراچی جولائی اگست ۱۹۹۱ء اور "فکشن کی

۱۔ گوپی چند نارنگ کی ساختیات شناسی۔ از پروفیسر وہاب اشرفی بشمولہ دیدہ ور نقاد ص ۶۲، ۶۳، ۶۴

شعریات اور ساختیات" مطبوعہ کتاب نما جنوری ۱۹۹۱ء
ہے۔ یہ دونوں ہی مضامین ساختیات کے حوالے سے
متعلقہ شعریات کی تفہیم کے لیے بہترین تدریسی توضیحی منطقی
اور عملی منظرنامہ پیش کرتے ہیں اور ضرورت اس بات
کی ہے کہ ان کی طرف بار بار رجوع کیا جائے۔ میرے خیال
میں اگر گوپی چند نارنگ ایسے مضامین نہیں لکھتے تو فیض
کی نظم کی پس ساختیاتی تنقید ان کے بس کی بات نہیں ہوتی
مطالعہ کیجئے "فیض کو کیسے نہ پڑھیں" ایک پس ساختیاتی
مطالعہ۔ مطبوعہ سوغات ستمبر ۱۹۹۱۔ یہ مضمون اس قدر
اوریجنل اور صدمہ پہنچانے والا ہے کہ DOXA کا
شکار بہت سوں کی سمجھ میں نہیں آیا اور وہ بہکی باتیں
کرنے لگے۔۔۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ گوپی چند نارنگ نے
ایسی عملی تنقید کا سلسلہ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے
تجزیئے اور "سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ" سے ہی شروع
کر دیا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ذہن ایک خاص نہج پر کام

کرنا شروع کر دیتا ہے تو پھر اس کا عمل پر اسرار طریقے پر بہت پہلے سے شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ "ساختیات پس ساختیات اور ردِ تشکیل" پر گوپی چند نارنگ کے مضامین ان مکاتب فکر کے اساسی پہلوؤں پر نہ صرف محیط ہیں بلکہ تنقیدی مطالعے کا ایک متنوع منظر نامہ پیش کرتے ہیں اردو کی دنیا میں چاہے متعلقہ تصورات جو بھی موڑ لیں گوپی چند نارنگ کا تاریخ ساز کام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور اردو میں ان افکار تازہ کے بنیاد گزاروں میں ان کی جگہ سرفہرست ہوگی"۔ ع[۱]

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ایک اور اہم ہم عصر نقاد پروفیسر مغنی تبسم ہیں۔ ان کا شمار اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے معماروں میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کو اعتبار اور وقار بخشنے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نمایاں کردار ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے لکھا ہے۔

"اردو میں گوپی چند نارنگ نے اپنی نگارشات کے ذریعے

ع[۱] گوپی چند نارنگ کی ساختیات شناسی۔ از پروفیسر وہاب اشرفی مشمولہ۔ دیدہ ور نقاد ۔ ص ۴۷

اسلوبیاتی تنقید کو خاصا وقار و اعتبار بخشا ہے۔ وہ ماہر لسانیات
ہونے کے علاوہ ایک صاحب ذوق نقاد بھی ہیں۔ قدیم و
جدید ادب کے سارے معنوی پہلو اور اسلوبیاتی تیور
ان کی نگاہ میں ہیں۔ انہوں نے عالمی ادب کا وسیع مطالعہ
کیا ہے۔ عصری علوم سے کما حقہ واقف ہیں۔ انسانی ارتقا
کی تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عصر حاضر
میں انسانی صورت حال کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں"۔ ۱ے

پروفیسر نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر
مغنی تبسم نے لکھا ہے۔

"انہوں نے اسلوبیاتی طریق کو کام میں لاکر مختلف قدیم و جدید
شعرا کے فکر و احساس کی نوعیت اور اسالیب اور اظہار کی
انفرادی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ "اسلوبیات میر"
"اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام" "نئی غزل کی معتبر
آواز۔ بانی"۔ ساقی فاروقی۔ زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے"

۱ے گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید۔ از پروفیسر مغنی تبسم۔ مشمولہ۔ دیدہ ور نقاد۔ ص ۷۶

"شہرِ مثال کا اردو مندرشاعر۔ افتخار عارف" "نئی شاعری اور اسمِ اعظم"۔ گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید کے چند نمایندہ اور کامیاب نمونے ہیں"۔ ؎۱

پروفیسر مغنی تبسم نے گوپی چند نارنگ کے تنقیدی دائرہ کار کی وسعت اور گہرائی کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی تنقیدی تحریروں میں موضوعات کے تنوع پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے۔

"گوپی چند نارنگ نے جہاں اردو شاعری کے کلاسیکی سرمایے کی نئے انداز سے تحسین کرتے ہوئے ہمارے تنقیدی ادب کو ایک نیا ذائقہ بخشا ہے وہیں جدید اور ہم عصر ادب کی تفہیم اور قدر شناسی کے سلسلے میں ان کی تحریروں نے رہنمایانہ رول ادا کیا ہے۔ انہوں نے جدید فکشن اور شاعری پر جو مضامین قلمبند کئے ہیں ان میں فنکاروں کے فکر و احساس کے مطالعے کے ساتھ زبان کے تخلیقی استعمال کے سلسلے میں بھی ان کے مخصوص رویوں کا جائزہ لے کر ان

۱؎ گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید۔ از پروفیسر مغنی تبسم۔ مشمولہ دیدہ ور نقاد ص ۷۷

کے اسالیب کی منفرد خصوصیات کی چھان بین بھی کی ہے"۔ ع۱

پاکستان کے مستند نقاد نظیر صدیقی نے اردو تنقید کے باب میں پروفیسر نارنگ کی تصنیف۔ "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کو حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد دوسری بنیادی نظریہ ساز تصنیف قرار دیا ہے اور یہ بات غلط بھی نہیں۔ "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" نے اردو میں ادبی تنقید کو جدت اور روشن خیالی ہی نہیں بخشی ہے بلکہ اردو شاعری اور فکشن کے تخلیقی عمل پر بھی خاطر خواہ اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسی بنا پر نظیر صدیقی نے لکھا ہے۔

"اردو کی سب سے اثر انگیز کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" از الطاف حسین حالی ۱۸۹۳ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کے ٹھیک ایک سو سال بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ کی انتہائی جامع اور مبسوط کتاب ادبی تھیوری پر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی ہے"۔ ع۲

نظیر صدیقی نے برصغیر میں اردو تنقید کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کے مقام

ع۱ گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید۔ از پروفیسر مغنی تبسم۔ مشمولہ۔ دیدہ ور نقاد ص ۷۸

ع۲۔ ادبی نظریہ سازی کا عمیق مطالعہ۔ از نظیر صدیقی۔ مشمولہ دیدہ ور نقاد ص ۱۰۲

اور مرتبہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو کے ان ممتاز ترین تنقید نگاروں میں سے ہیں جو آزادی کے بعد کے زمانے میں سامنے آئے۔ وہ پروفیسر حسن عسکری سے عمر میں چھوٹے رہے ہونگے لیکن اپنی اس انتہائی باوقار تصنیف کی بدولت وہ حسن عسکری کے بعد اردو کے سب سے اہم نقاد بن کر اُبھرے ہیں۔ اگرچہ بعض دوسرے ممتاز ہم عصر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی، مظفر علی سید، ڈاکٹر وزیر آغا، وارث علوی یا باقر مہدی ادبی اسکالرشپ میں ڈاکٹر نارنگ کے ہم رتبہ یا شاید ان سے بھی بڑھ کر ہوں لیکن ان کے تنقیدی اثاثہ کا مقابلہ اب گوپی چند نارنگ سے مشکل ہی کیا جاسکے گا۔ ڈاکٹر نارنگ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں یکساں طور پر مشہور و مقبول ہیں۔ ان کی برتری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف قلم کے دھنی ہیں بلکہ ان میں تقریر کا بھی خداداد ملکہ ہے۔ ہر چند کہ تقریر کی صلاحیت

کا شمار کسی نقاد یا ادیب کا وصف اساسی نہیں نقاد کی
اصل کسوٹی یہی ہے کہ وہ کیا لکھتا ہے نہ یہ کہ وہ کیا کہتا
ہے۔" [1]

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مذکورہ بالا معاصر نقادوں کے علاوہ اردو کی دوسری اور تیسری صف کے ناقدین نے بھی پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے بارے میں اہم خیالات ظاہر کئے ہیں۔ ایسے چند ایک ناقدین کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

مشہور نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے "ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات کے" حوالے سے اپنا مضمون قلم بند کرتے ہوئے پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے بارے میں لکھا ہے :۔

"...... بلاشبہ گوپی چند نارنگ نے ماضی بعید کو صیغہ حال
سے بڑی خوبی کے ساتھ ربط دینے کی کوشش کی ہے۔
ان کا بنیادی تھیس (موقف) بھی یہی ہے کہ ایک
طرف مغرب میں ساختیات کے بنیادی آثار ارسطو اور

---

[1] ۔ ادبی نظریہ سازی کا عمیق مطالعہ۔ از نظیر صدیقی۔ مشمولہ۔ دیدہ ور نقاد، ص ۱۰۲

[illegible] بنیادی [illegible]

[illegible] انفرادی [illegible] ہمہ گیریت فراہم کرتی ہے مگر افلاطون اور اس کے پیروکاروں کے اثرات بھی اس میں گھلتے ملتے رہے نتیجتاً یہ دونوں رجحانات ادب و تنقید کی تاریخ میں کبھی پہلو بہ پہلو اور کبھی ایک دوسرے پر سبقت لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم ارسطو جسے استادوں کا استاد کہا گیا ہے۔ تقریباً ہر دور میں کسی نہ کسی صورت اپنی قوت کا احساس دلا ہی دیتا ہے۔ جس کی ایک صورت ساختیاتی شعریات میں عمل آور ہے دوسری طرف مشرقی شعریات جو (سنسکرت، عربی اور فارسی روایات پر مبنی ہے) کے تسلسل کی وہ تاریخ ہے جس کا ایک سرا قبل مسیح سے جا کر ملتا ہے۔

اس حوالے سے پروفیسر عتیق اللہ نے مزید لکھا ہے۔

"گوپی چند نارنگ نے نئے علمی تناظر میں نہ صرف سنسکرت شعریات کو نئے معنی اور نیا ربط دینے کی سعی کی ہے بلکہ اسی انداز فکر کے ساتھ عربی اور فارسی نظام شعریات کی

تاریخ کو بھی نئی نظر سے دیکھا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے
ایک طرف ساختیات کی روایت سے اس کے ڈانڈے
ملائے ہیں اور سنسکرت شعریات کی طرح اسے بھی
ساختیات کا بعیدی پیش رو قرار دیا ہے۔ بلکہ ان تضادات
اور تناقضات کو بھی رفع کرنے کی سعی کی ہے جو مشرق
کی عظیم تر وحدتِ علمی کے تصور میں حارج ہیں گویا ضمنی اور
ذیلی اختلافات کے باوجود عرب و عجم تا برصغیر ہند ایک
وسیع تر ذہنی یکجہتی پائی جاتی ہے" ۱؎

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے خود مشرقی و مغربی شعریات کے حوالے سے عمدہ مضامین
لکھے ہیں انہوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تصنیفات کا ان کے تنقیدی
رویّوں کے حوالے سے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"گوپی چند نارنگ کے تنقیدی رویوں کے سلسلے میں بالعموم
ان کے ایسے مضامین کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کا تعلق اطلاقی
اور عملی تنقید سے ہے۔ جہاں تک نظری اور اصولی مضامین

۱؎ مضمون ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات از عتیق اللہ مشمولہ دیدہ ور نقاد ص ۲۰۶

کا سوال ہے تو یہ بات پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ انہوں
نے اصول تنقید سے تعلق رکھنے والی جو تحریریں لکھی ہیں ان
کا رشتہ لسانیات سے شروع ہو کر اسلوبیات اور ساختیات
سے گزرتے ہوئے مابعد ساختیاتی نظریات سے جا ملتا
ہے۔ اس مضمون میں اس سلسلے کی سب سے اہم کاوش
"ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" سے
شعوری طور پر صرف نظر کیا گیا ہے اس کتاب میں پروفیسر
نارنگ نے ادبی تھیوری کے نئے مسائل و مباحث کو
منصوبہ بند طریقے پر نہایت منظم، منضبط اور مربوط انداز
میں پیش کیا ہے۔ اس سے شعریات کی ایک نئی دنیا
سامنے آتی ہے۔ گزشتہ دو تین دہائیوں میں نئی تھیوری
نے ادبی تنقید کو جن نئی جہات سے روشناس کرایا
ہے۔ ان کی بصیرت گوپی چند نارنگ کی اس نوع کی
تحریروں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس لیے یہ بھی
کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تنقید کا سب سے نمایاں

رجحان گو کہ اسلوبیاتی رہا ہے مگر وہ ساختیاتی فکر کے حوالے سے ادبی حسن کاری کے اسرار تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔" ؎۱

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے طریق نقد کی وضاحت کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا ہے کہ

"گوپی چند نارنگ نے اپنی تنقید میں جس نوع کے استدلالی اور تجزیاتی طریق کار کو رائج کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس بات پر دال ہے کہ وہ تنقید کے بنیادی منصب اور نقاد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی رویوں میں یہ بات سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ متعلقہ علوم سے کسب فیض کر کے نظری اور عملی سطح پر ان کو پوری وضاحت کے ساتھ اپنے شعری اور ادبی سرمایے پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات کسی بھی ناقد کے غیر معمولی امتیاز کی حامل ہو سکتی ہے۔" ؎۲

؎۱ مضمون "گوپی چند نارنگ کے تنقیدی رویے۔ از پروفیسر ابوالکلام قاسمی، مشمولہ۔ دیدہ ور نقاد ص ۱۱۸

؎۲ ایضاً " " " " ص ۱۱۹-۱۱۸

مشہور نقاد محمود ہاشمی نے پروفیسر نارنگ کی تصنیف "ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کو "جدید اردو تنقید کی لال کتاب" قرار دیتے ہوئے نظریہ سازی (تھیوری) کے حوالے سے حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" سے اس کا موازنہ کیا ہے اور پھر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ۔

"مقدمہ شعر و شاعری کی نوعیت خود حالی کی اپنی شاعری کے لیے DEFENCE پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی نوعیت ذہن انسان کی لامتناہی وسعتوں اور آزادئ معنی کی ایک نئی کائنات کی دریافت ہے مجھے احساس ہے کہ میں خود اور میرے احباب جیسے شمس الرحمٰن فاروقی ان تمام مفکروں کو پڑھتے رہے ہیں۔ جن کے وسیلے سے نارنگ صاحب نے ایک مبسوط نظام اور ایک موڑ کو دریافت کیا ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے کبھی ٹھہر کر اور سنبھل کر ان مباحث کو موضوع نہیں بنایا۔ نارنگ صاحب نے اس جوہر کو جس طرح تلاش کیا ہے اور جس طرح اپنی تصنیف کا حصہ بنایا ہے یہ کام کم از کم ہم جیسے

آزادہ رووں کے بس کا نہ تھا۔ اس کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسا تخلیقی، محنتی اور DYNAMIC ذہن درکار تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کتاب کے بعض ابواب مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ان کے بارے میں اختلافی مضامین بھی لکھے گئے...

نارنگ صاحب نے مشرقی شعریات والے صحیفہ کے ذریعے کم از کم اس روایت کا احترام کیا ہے جو نئے سے نئے تصورات میں بھی ماضی کی بہترین فکر کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔"[۱]

محمود ہاشمی، بنیادی طور پر پروفیسر نارنگ کے نظریات و خیالات سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتے لیکن اس مضمون میں انہوں نے کھلے دل سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس تنقیدی کارنامے کا اعتراف کیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ایک ہم عصر نقاد مظفر علی سید بھی ہیں۔ پاکستان کی اردو تنقید میں ایک خاص مقام رکھنے والے مظفر علی سید کا شمار گنے چنے

---

[۱] جدید اردو تنقید کی لال کتاب۔ از محمود ہاشمی، مشمولہ دیدہ ور نقاد ص ۲۶۷

حد درجہ با مطالعہ اور سنجیدہ ناقدین میں ہوتا ہے۔ عالمی ادب کے نظریات و رجحانات کی گہری آگہی رکھنے والے مظفر علی سید نے پروفیسر نارنگ کی تصنیف "قاری اساس تنقید" کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"قاری اساس تنقید مظہریت اور قاری کی واپسی" میں پروفیسر نارنگ نے جرمن فلسفۂ مظہریت اور ہرمینیات (HERMENCUTICS) کے مرکزی نکات سے بحث کی ہے اور پھر نمایندہ فلسفیوں اور اہل نقد کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان بنیادوں پر کس طرح قاری اساس تنقید کا نظریہ وجود میں آیا اور مغرب کی روایت میں اس کے نمایاں دستخط کون کون سے ہیں اور ادبی نقد میں ان کا کارنامہ کیا ہے۔ مفکرین کے ناموں اور تصورات کا تنوع اگرچہ کہیں کہیں بھاری معلوم ہوتا ہے تاہم کتاب ایک نہایت وسیع اور اہم موضوع کا نہایت سلیس اور عام فہم انداز میں تعارف

کراتی ہے اور اس کی جملہ جہات کا احاطہ کرتی ہے ڈاکٹر
نارنگ نے وولف گانگ آیزر، ہالنس روبرٹ یاؤس
اور نورمن ہولینڈ کے مرکزی بحث پر مناسب توجہ کی
ہے اور مضمر قاری کے تصور کی گرہوں کو کھولتے ہوئے
قرأت کا تفاعل بطور جمالیاتی تجربہ کا بھی جائزہ لیا ہے
اس بحث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ قاری کس
طرح اپنے ذہنی رویّوں اور تصورات کی مدد سے اور بدلتی
ہوئی توقعات کے افق پر کسی بھی متن کے معنی کو بالفعل
موجود بناتا ہے ...... ڈاکٹر نارنگ نے مدلل بتایا ہے
کہ قرأت کے تفاعل کے دوران خود قاری کی نوعیت بھی
بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ ہم کسی متن کو جوں کا توں قبول
نہیں کرتے جیسا کہ وہ خلق کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ
یہ وضاحت بھی کردی گئی ہے کہ قاری ہر چند کہ بے حد
اہمیت رکھتا ہے لیکن قاری بھی مقتدر نہیں ہے۔ کیونکہ
اخذِ معنی کا عمل لامتناہی ہے۔ پولے کے بقول قاری خود اپنے

خیالات اور تجربات کو متن میں معروضیاتا ہے اور مصنف کے شعور سے بھی اپنی مطابقت پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ خود مشرقی روایت میں قاری اور مصنف کے رشتے کا احساس مضمر رہا ہے اور بعض جگہ تو سخن فہمی کو سخن گوئی پر ترجیح دی گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے مغربی فکر اور مشرقی روایت کے مقاماتِ اشتراک پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن ان کی تنقید اپنی بلندی پر وہاں ملتی ہے جہاں انہوں نے قاری اساس تنقید کے مرکزی نکات کی وضاحت میں میر تقی میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے اشعار کی بدلتی معنویتوں سے بحث کی ہے''۔ ۱؎

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کے بارے میں ان کے مذکورہ بالا اہم عصروں کے علاوہ نوجوان ناقدین مثلاً انیس اشفاق، نعیم اعظمی، شافع قدوائی، پروفیسر صادق، پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر شہزاد انجم،

۱؎۔ قاری اساس تنقید۔ نارنگ کی خیال افروز کتاب۔ از مظفر علی سید۔ مشمولہ دیدہ ور نقاد۔ صفحہ ۳۰-۳۱

ابرار رحمانی اور مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ نے بھی اردو کے اس عظیم دیدہ ور نقاد کی تنقید نگاری کے بارے میں ان کی تصنیفات، تالیفات اور تبصرات کی روشنی میں اپنے اپنے مقام اور معیار سے روشنی ڈالی ہے۔ اور ان مستند اور غیر مستند بزرگ اور نوجوان ناقدین کے افکار و خیالات پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو روشن کر دیتے ہیں۔ ؏

●

محاکمہ

اردو کے دیدہ ور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ، عصر حاضر کے ان نقادوں میں سے ایک ہیں جنہیں بین الاقوامی سطح پر ایک ممتاز و منفرد" اردو دانشور" کی حیثیت سے جانا اور مانا جاتا ہے۔ اور جہاں تک بحیثیت تنقید نگار ان کی اہمیت اور انفرادیت کا سوال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ اردو کے واحد ایسے نقاد اور دانشور ہیں جنہیں، ان کی اردو دوستی، اردو زبان وادب کی ترویج و اشاعت اور اردو میں تازہ ترین عرفان و آگہی اور سوچ اور فکر کی نشر و اشاعت اور تحقیق و تنقید کو نئے امکانات سے روشناس کروانے کے حوالے سے اپنی زندگی میں ہی ایک لیجنڈ LEGEND کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ عصری اردو تنقید کی پہلی صف میں چاہے جتنے نقادوں کو کیوں نہ کھڑا کیا جائے گوپی چند نارنگ کا قد بلاشک و شبہ ان سب سے بلند و بالا اور پُر کشش دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے دنیا بھر میں بکھرے ہوئے اردو کے قارئین پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تصنیفات و تالیفات کے ساتھ ساتھ ان کی "حیات" ان کی "شخصیت" کے بارے میں بھی زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خاندان اصلاً مغربی پنجاب میں " لیہ " مظفر گڑھ کا ہے اور ان کے پرکھے وہاں صدیوں سے آباد تھے۔ ان کی گوتر "کشیپ" ہے جو ورن کے اعتبار سے کھتری ہوتے ہیں۔ ان کے دادا شری چمن لال نارنگ زراعت پیشہ تھے۔ ننہال بھی زراعت پیشہ تھی۔ پروفیسر نارنگ کے والد بلوچستان میں ریونیو افسر مقرر ہوئے اور پھر وہیں بس گئے۔ بلوچستان کی ہی ایک تحصیل " دُکی " میں گوپی چند نارنگ کی پیدائش ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں خود پروفیسر نارنگ نے لکھا ہے کہ "مجھے نہیں معلوم کہ میں کب پیدا ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ چوتھے درجے میں جب نئے اسکول میں داخل ہوا تو نیا فارم بھرنے کی ضرورت پیش آئی۔ والد صاحب نے تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۳۱ لکھوادی۔ نوروز کا نوروز، سالگرہ کی سالگرہ۔ اس دن سے یہی تاریخ پیدائش چلی آتی ہے۔ پروفیسر نارنگ کے مطابق ان کی پیدائش کے ڈیڑھ سال بعد والد صاحب موسیٰ خیل آ گئے۔ نارنگ صاحب کے بچپن کا ایک حصہ اسی موسیٰ خیل میں گذرا۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے بچپن کے موسیٰ خیل کے دھندلے نقوش کو بڑے خوبصورت انداز میں اُتارا ہے " مکانوں کے پیچھے بڑا سا باغیچہ جس میں انار، ناشپاتی اور شفتالو کے درخت اور انگور کی بیلیں تھیں چاروں

طرف چھوٹے بڑے پہاڑ، مختصر سا بازار جس میں ڈاک کی لاری رُکا کرتی تھی۔ سب بچے اسی میں چڑھ جاتے اور ڈاک گھر سے بازار تک کی سیر کرتے۔ مغرب میں پتھریلی سڑک تھی جو فورٹ سنڈے من کو جاتی تھی اسی کے راستے میں ندی پر وہ پل تھا جس کے نیچے گہرے نیلے پانی میں ہم کنکر پھینکتے تو مچھلیوں کے سنہرے پر چمکنے لگتے۔ موسیٰ خیل سے پرائمری کرنے کے بعد گوپی چند نارنگ "لیہ" مظفر گڑھ چلے آئے اور وہاں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ بیچ میں دو تین سال کوئٹہ کے پیشین میں بھی زیر تعلیم رہے لیکن ہائی اسکول کا امتحان لیہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے ہی پاس کیا۔ نارنگ صاحب ایک ذہین طالب علم تھے اور اکثر کلاس میں اول آتے تھے ہائی اسکول کے بعد پہلے پہل وہ منڈے من کالج کوئٹہ میں داخلہ کے لئے پہنچے جہاں اچھے نمبرات کی وجہ سے فیس تو معاف ہو گئی لیکن وظیفہ نہیں ملا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ تو وظیفہ نہ ملنے کی وجہ سے اور کچھ والد صاحب کی بنا پر   لائل پور زراعتی کالج کا رُخ کیا لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں داخلے کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ یہ زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ سیاسی خلفشار، فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائیاں۔ ہجرتوں کا لامتناہی سلسلہ۔ گوپی چند نارنگ انہیں حالات میں دہلی چلے آئے۔ نارنگ صاحب

دہلی میں تنہا تھے۔ گھر والے پیشاور میں۔ تقسیم ملک نے پروفیسر نارنگ اور ان کے گھر والوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی۔ اس دوران نارنگ صاحب کو جینے کے لئے جی کی مشقت کے تقاضے پورے کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ انہیں کچھ عرصہ کے لئے لیبر انسپکٹر کے طور پر بھی کام کرنا پڑا لیکن اس کڑے وقت میں بھی انہوں نے اپنی خود اعتمادی، حوصلہ اور ذوق و شوق کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہیں حالات میں اجمیر بورڈ سے ایف اے اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ تین چار برسوں پر مشتمل وقت کا یہ ٹکڑا کتنا آتشیں کتنا دکھ بھرا رہا ہوگا۔ اس کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے حالات زندگی اور خاندانی پس منظر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن تقسیم ملک کے سانحہ کے آس پاس کے برسوں میں ان پر ان کے خاندان پر اور اس امن پسند سرزمین کے عام لوگوں پر جو کچھ بھی گذری اور یہ سب دیکھ کر اور جھیل کر خود نارنگ صاحب کے دل پر کیا گذری ہوگی اس کا ذکر بھی کرنے سے وہ ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ یہ ان کی وضع داری اور شرافت کا تقاضہ تھا۔ لیکن اس عرصہ میں اپنے دل کی لگی کی جانب اشارہ کرنے سے پرہیز نہیں کیا ہے۔ کالج کے دنوں میں ہی "والدین ایک جگہ رشتہ ٹھہرا چکے تھے کہ ایک لڑکی سے

شناسائی ہوئی۔ تقریباً آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا۔ اور جب ایک آدھ بندش بھی عائد ہوگئی تو زندگی ہیر وکی پیروڈی سی ہوکر رہ گئی بہر حال پرانا رشتہ منسوخ اور نیا مقرر ہوا۔ انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۵۴ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ اور وہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کے لئے ان کا موضوع "اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ" تھا۔ اپنے اس مقالے کی بنیاد پر پروفیسر گوپی چند نارنگ تین ضخیم کتابیں منظر عام پر لا چکے ہیں۔

۱۔ "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں"

۲۔ "اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب"۔ اور تیسری کتاب کا عنوان "ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری" ہے۔ یہ تینوں کتابیں مل کر پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بھی اپنی علم کی پیاس بجھنے نہیں دی اور پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں آنرز کی ڈگری حاصل کی، دہلی یونیورسٹی سے لسانیات میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کیا اور انڈیانا یونیورسٹی سے سمعیات اور تشکیلی گرامر پر خصوصی کورس کیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ باضابطہ طور پر درس و تدریس سے ۱۹۵۸ء میں

وابستہ ہوئے جب وہ باقاعدہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر مقرر ہوئے اس سے پہلے تھوڑے عرصے کے لئے انہوں نے سینٹ اسٹیفن کالج میں جزوقتی لیکچرر کے طور پر بھی کام کیا۔ ۱۹۶۱ء میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ہی ریڈر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ اسی دوران کامن ویلتھ فیلوشپ بھی ملا ان کی غیر معمولی خدمات کے پیش نظر انہیں سوویت روس میں ملازمت کی پیش کش بھی ہوئی لیکن انہوں نے بعض وجوہات کی بنا پر منظور نہیں کیا۔ لیکن جب وسکانسن یونیورسٹی نے انہیں "وزٹنگ پروفیسر" کی پیش کش کی تو انہوں نے اسے قبول کرلیا اور ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک کا زمانہ انہوں نے وسکانسن یونیورسٹی اور مینی سوٹا میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے گزارا یہ پورا عرصہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے درس و تدریس، مطالعہ اور تحقیق و تنقید میں گزارا۔ وسکانسن میں اپنے قیام کے دوران پروفیسر نارنگ نے اپنی لسانیات کی تربیت مکمل کی۔ ۱۹۷۰ء میں وسکانسن سے واپس آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تقرری بحیثیت پروفیسر اردو جامعہ ملیہ دہلی میں ہوگئی جہاں انہوں نے بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ اردو وہ تک نہ صرف درس و تدریس سے وابستہ رہے بلکہ اس وقت جامعہ ملیہ کا شعبہ اردو جس عمارت میں واقع ہے۔

پروفیسر مظفر حنفی کے مطابق اس کی زمین بھی پروفیسر نارنگ نے خود ہی اپنی کوششوں سے بہت معمولی قیمت پر خریدوائی اور اپنی نگرانی میں ہی نہ صرف عمارت بنوائی بلکہ الماری میز کرسیاں وغیرہ بھی خود ہی تیار کروائیں۔ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی ادبی سرگرمیاں کم نہیں ہوئیں اسکا ثبوت ان کی وہ کتابیں ہیں جو ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد شائع ہوئیں۔ پروفیسر نارنگ نے ایک عرصہ تک قومی کونسل برائے فروغِ اردو دہلی کے چیرمین کی حیثیت سے

جو بیش بہا خدمات انجام دیں ان کی بنا پر انہیں پہلے پدم شری اور پھر پدم بھوشن جیسے اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے وہ ساہتیہ اکادمی کے صدر کے عہدے پر فائز ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ دیگر ہندوستانی زبانوں اور ادب کے فروغ کے ضمن میں اہم کارنامے انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر نارنگ کو اب تک ہندوستان، پاکستان، امریکہ کناڈا اور سعودی عرب میں اتنے انعامات اور اعزازات سے نوازا جا چکا ہے کہ ان کا شمار بھی اب مشکل ہے۔ پاکستان کے ادیبوں کے ساتھ ہندوستانی ادیبوں کے رشتے استوار کرنے بلکہ ہند پاک دوستی کی راہ ہموار کرنے میں بھی پروفیسر نارنگ

کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ اسکولی طالب علمی کے زمانے میں ان کے افسانے کوئٹہ کے ہفتہ وار اخبار "بلوچستان سماچار" میں شائع ہوئے لیکن پروفیسر نارنگ فسوں و افسانہ کے لیے نہیں، تحقیق و تنقید کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے "اکبر الہ آبادی ہندوستان اور پاکستان کی نظر میں" کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۵۳ء میں اس زمانہ کے مشہور ادبی رسالہ "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اس پہلے تنقیدی مضمون سے ہی اس عہد کے صاحبان علم و فکر نے یہ اندازہ لگالیا کہ اردو میں ایک ہونہار اور خالص نقاد پیدا ہو چکا ہے۔ اور گوپی چند نارنگ نے اپنے مضامین اور کتابوں سے جلد ہی یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک منفرد اور ممتاز نقاد ہیں اور اردو زبان و ادب سے متعلق ان کے افکار و خیالات، تصورات و اجتہادات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پروفیسر نارنگ کی ادبی خدمات کا اندازہ ان کی تحریروں کی درج ذیل فہرست سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

موضوع	سن اشاعت
۱۔ اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر (غیر مطبوعہ)	
مقالہ برائے پی ایچ ڈی	۱۹۵۷ء
۲۔ معراج العاشقین (مقدمہ و تحشیہ)	۱۹۵۷ء
آزاد کتاب گھر (دہلی)	
۳۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں	
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) (طبع اول)	۱۹۶۰ء
۴۔ KARKHANDARI DIALECT OF DELHI URDU -	
MUNSHI RAM MANOHARLAL (DELHI)	۱۹۶۱ء
۵۔ اردو کی تعلیم کے لسانی پہلو (طبع اول)	۱۹۶۱ء
آزاد کتاب گھر (دہلی) (طبع دوم)	۱۹۶۳ء
۶۔ ادبی تحریریں (ڈاکٹر زور) مرتبہ	
ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد)	۱۹۶۳ء

۷۔ URDU : READINGS IN LITERARY

URDU PROSE. طبع اول ۱۹۶۸ء

WISCONSIN UNIVERSITY PRESS (AMERICA)

NATIONAL COUNCIL FOR

PROMOTION OF URDU LANGUAGE

(NEW DELHI) طبع دوم انڈین ایڈیشن ۲۰۰۱ء

۸۔ منشوراتِ کیفی (ترتیب و مقدمہ) ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو ہند (دہلی)

۹۔ آثارِ محروم (مرتبہ)

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ (دہلی) ۱۹۶۹ء

۱۰۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (باشتراک) ۱۹۷۰ء

مکتبہ شاہراہ (دہلی)

۱۱۔ ارمغانِ مالک (مرتبہ) ۱۹۷۱ء

مجلس ارمغانِ مالک (دہلی)

۱۲۔ املانامہ (مرتبہ) ۱۹۷۴ء

ترقی اردو بیورو (دہلی)

۱۳۔ پرانوں کی کہانیاں
نیشنل بک ٹرسٹ (دہلی) ۱۹۷۶ء

۱۴۔ اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں (مرتبہ)
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ (دہلی) ۱۹۷۹ء

۱۵۔ وضاحتی کتابیات، جلد اول بابت ۱۹۷۶ء (باشتراک) ۱۹۸۰ء
ترقی اردو بیورو (دہلی)

۱۶۔ اردو افسانہ : روایت اور مسائل (مرتبہ)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس (دہلی) ۱۹۸۱ء

۱۷۔ انیس شناسی (مرتبہ)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس (دہلی) ۱۹۸۱ء

۱۸۔ انڈین پوئٹری ٹوڈے (انگریزی) (جلد چہارم: حصہ اردو)
انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (دہلی) ۱۹۸۱ء

۱۹۔ سفر آشنا
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس (دہلی) ۱۹۸۲ء

۲۰۔ اقبال کا فن (مرتبہ)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس (دہلی) ۱۹۸۳ء

۲۱۔ نئی کرن

این سی ای آر ٹی (دہلی) ۱۹۸۳ء

۲۲۔ نئی روشنی

این، سی، ای، آر ٹی (دہلی) ۱۹۸۳ء

۲۳۔ بڑھو اور بڑھو

ایضاً (دہلی) ۱۹۸۳ء

۲۴۔ اضافی کتابیات، بابت جلد دوم ۷۸-۱۹۷۷ء (باشتراک)

ترقی بیورو (دہلی) ۱۹۸۴ء

۲۵۔ لغت نویسی کے مسائل (مرتبہ)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) ۱۹۸۴ء

۲۶۔ اسلوبیاتِ میر

(۱) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۸۴ء

(۲) انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) ۱۹۸۵ء

۲۷۔ CONTRIBUTION OF URDU WRITERS TO INDIAN FREEDOM MOVEMENT (P. 527 – 570) INDIAN WRITERS UNION (KERALA) (مرتبہ) ۱۹۸۵ء

۲۸۔ سانحۂ کربلا بطور ایک شعری استعارہ (طبع اول: دہلی) ۱۹۸۶ء
سنگ میل پبلی کیشنز (دہلی) (طبع دوم: لاہور) ۱۹۹۱ء

۲۹۔ انتظار حسین اور ان کے افسانے (مرتبہ)
ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ) ۱۹۸۶ء

۳۰۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ گیارہ ــــ باشتراک)
این سی ای آر ٹی (دہلی) ۱۹۸۶ء

۳۱۔ امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر
(۱) امیر خسرو سوسائٹی امریکہ شکاگو (طبع اول) ۱۹۸۷ء
(۲) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور (طبع دوم) ۱۹۹۱ء
(۳) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (طبع سوم) ۱۹۹۱ء

۳۲۔ نیا اردو افسانہ: انتخاب، تجزیے اور مباحث (مرتبہ) ۱۹۸۸ء
دہلی اردو اکادمی (دہلی)

۳۳۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ بارہ ــــ باشتراک) ۱۹۸۹ء
این سی ای آر ٹی (دہلی)

۳۴۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۸۹ء

۳۵۔ راجندر سنگھ بیدی (انگریزی تھالوجی) ۱۹۸۹ء
ساہتیہ اکادمی (دہلی)

۳۶۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ اول) ۱۹۸۹ء
این، سی، ای، آر، ٹی (دہلی)

۳۷۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ دہم) ۱۹۸۹ء
ایضاً

۳۸۔ کرشن چندر (انگریزی تھالوجی) ۱۹۹۰ء
ساہتیہ اکادمی (دہلی)

۳۹۔ املانامہ (نظر ثانی و اضافہ) ۱۹۹۰ء
ترقی بیورو (نئی دہلی)

۴۰۔ अमीर खुसरो का हिन्दवी काव्य (امیر خسرو کا ہندوی کلام) ۱۹۹۱ء
(सीमान्त प्रकाशन दिल्ली) (سیمانت پرکاش دہلی)

۴۱۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ پنجم۔ باشتراک) ۱۹۹۱ء
این، سی، ای، آر، ٹی (دہلی)

۴۲۔ اردو کی نئی کتاب (برائے درجہ دوم) ۱۹۹۱ء
ایضاً

۴۳- URDU LANGUAGE & LITERATURE
CRITICAL PERSPECTIVES/ STERLING PUBLISHERS (NEW DELHI) ۱۹۹۱ء

۴۴- قاری اساس تنقید
ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ) ۱۹۹۲ء

۴۵- ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۹۳ء

۴۶- اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) جولائی ۲۰۰۲ء

۴۷- ترقی پسندی جدیدیت اور مابعد جدیدیت
ایڈشاٹ پبلی کیشنز ممبئی۔ ۲۰۰۴ء

گوپی چند نارنگ نے اردو انگریزی اور ہندی زبانوں کو جو عطیات دیئے ہیں انکی تفصیل مندرجہ بالا تصنیفات و تالیفات پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے علاوہ بھی اردو ادب کو انگریزی اور ہندی زبانوں کے حوالے سے گرانقدر عطیات عنایت کئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مثلاً ان کی چند ہندی اور انگریزی کتابوں کی تفصیل یوں ہے:

۴۸- اردو کی نئی بستیاں
ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۲۰۰۶ء

۴۹- اردو زبان اور لسانیات - رام پور رضا لائبریری ۲۰۰۶ء

1. LET US LEARN URDU: BIGGINERS MANUAL FOR URDU SCRIPT.
2. BALWANT SINGH: SLECTED SHORT STORIES.
3. ANTHOLOGY OF MODERN POETRY FOR INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS.

وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہندی میں بھی کتابوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہونے لگی ہے جن میں نمونتاً چند ایک اسطرح ہیں :

1. पाठक आधार आलोचना (یاٹک آدھار آلوچنا)
2. संरचनावाद, उत्तर संरचनावाद एक प्राच्य काव्य शास्त्र — سانرچنواد اترسانرچیواد ایک پراچیہ کاوی شرتر
3. बलवन्त सिंह की श्रेष्ठ कहानियाँ — بلونت سنگھ کی شرلیسٹ کہانیاں
4. उर्दू कैसे लिखें ! (اردو کیسے لکھیں)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مذکورہ بالا تصنیفات میں یوں تو سب کی سب اہم اور تاریخ ساز کارنامے ہیں لیکن چند ایک ایسی ہیں جنہیں پروفیسر نارنگ کا اردو تحقیق و تنقید میں اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ ایسی تصنیفات میں سب سے پہلے "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" کا ذکر آتا ہے۔ جو دراصل پروفیسر نارنگ کا پی' ایچ' ڈی کے مقالے کا ایک حصہ تھا جسے انہوں نے پہلی بار ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ بعد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے دوبارہ ۲۰۰۱ء میں اسے دوبارہ شائع کیا۔ یہ تصنیف پروفیسر نارنگ کا تحقیقی کارنامہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس میں جگہ جگہ ضرورت کے مطابق پروفیسر نارنگ نے اپنے تنقیدی خیالات کا بھی برمحل اظہار کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اردو مثنویوں کی اقسام اور ان کی لسانی' موضوعاتی' فنی اور جمالیاتی اہمیت کا تفصیل کے ساتھ تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور ایک خاص نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ اردو مثنویوں میں ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔

اردو میں فقط یوسف زلیخا' لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد ہی نہیں' ہیر رانجھا

سسی پنوں، سوہنی مہیوال، مرزا صاحباں بھی ہیں۔ اسی طرح شکنتلا اور کامروپ و کلا کام بھی ہیں۔

پروفیسر نارنگ کی تصنیف "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں" کے مطالعے سے نارنگ کے سیکولر مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔

مثنویوں کی طرح ہی پروفیسر نارنگ نے اردو مرثیوں کا جائزہ بھی ایک بالکل ہی نئے اور انوکھے زاویئے سے لیا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال ان کی کتاب" سانحہ کربلا بطور ایک شعری استعارہ" ہے۔ جس میں پروفیسر نارنگ نے سانحہ کربلا کی حیثیت اور معنویت کو نہ صرف مذہبی اور ایمانی اعتبار سے شدت سے محسوس کیا ہے بلکہ شعری سطحوں پر بھی سانحہ کربلا کے اثرات کا حوالوں اور دلائل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔

گوپی چند نارنگ کی ایک بے حد اہم تصنیف "اسلوبیات میر" ہے۔ یہ ایک خطبہ ہے جو انہوں نے ۱۹۸۴ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی دعوت پر کراچی اور لاہور میں بابائے اردو مولوی عبدالحق یادگاری خطبہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ جسے بعد میں پاکستان اور ہندوستان میں کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ اس مقالے میں پروفیسر نارنگ نے میرؔ کی شاعری کا فنی

اسلوبیاتی، جمالیاتی اور موضوعاتی ہر اعتبار سے ایک جامع جائزہ پیش کیا ہے اور یہ

"میر اردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں جن کے یہاں اردو کی جتنی شانیں جتنے ذیلی اسالیب اور جتنی لسانی جہات ملتی ہیں اتنی بعد کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔ غالب اور اقبال کی عظمت مسلم، لیکن غالب یا اقبال کے شعری اسالیب میں اتنا تنوع نہیں ہے تاریخ کے مختلف لمحات میں رائج ہونے والے مختلف اسالیب کے مختلف دھاروں کے باہم موج زن ہونے سے جو کیفیت میر کے یہاں پیدا ہوتی ہے بعد میں وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔"

دراصل یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پروفیسر نارنگ ایک ایسے منفرد نقاد ہیں جنہوں نے روایتی اور کلاسیکی سے لے کر جدید اور مابعد جدید ادبی روایات، شعریات اور نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی لیے پروفیسر نارنگ میرؔ ہی نہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ، ولیؔ اور امیر خسروؔ وغیرہ شاعروں اور پریم چند اور منٹوؔ

کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی، انتظار حسین اور سید محمد اشرف جیسے افسانہ نگاروں کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مختلف النوع روایات، اقدار نظریات، رسومات، افتراقات اور اجتہادات سے، حدود و قیود سے آزاد ہوکر بحث کی ہے اور قائل کرنے والے نتائج اخذ کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے تمام اہم اور نمایندہ ہم عصر ناقدین نے پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کے اس انفراد اور امتیاز کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ میرے اس مقالے کے تیسرے باب میں سرسید تحریک ترقی پسند تحریک، جدید اور مابعد جدیدیت کے حوالے سے پروفیسر نارنگ کے کثیر الابعاد تنقیدی رویہ اور طریقہ کار پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اسی طرح باب چہارم میں مختلف اصناف کے حوالے سے گوپی چند نارنگ کی اس ہمہ جہت تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے انفراد و امتیاز کا اندازہ ان کے معاصرین کی ان تحریروں سے بھی لگایا جاسکتا جو انہوں نے اس غیر معمولی نقاد (نارنگ) کی حیثیت، اہمیت اور مقام کے بارے میں لکھی ہیں۔ نارنگ کے معاصر نقادوں میں سے شمس الرحمٰن فاروقی، جمیل جالبی، حامدی کاشمیری

وہاب اشرفی، فیصل جعفری، نظیر صدیقی، صادق، عتیق اللہ اور ابو الکلام قاسمی سے لے کر انیس اشفاق، نظام صدیقی، شافع قدوائی، شہزاد انجم، اور ابرار رحمانی تک کے خیالات اس مقالہ کے باب پنجم میں نقل کئے گئے ہیں۔

مختصراً یہ کیا جا سکتا ہے کہ " ڈاکٹر گوپی چند نارنگ عصر حاضر میں اردو تنقید کے میر کارواں ہیں ان کی مادری زبان اردو نہیں سرائکی ہے لیکن اس کے باوجود اردو زبان اور تہذیب ان کی رگوں میں لہو کی طرح رواں دواں ہے۔ اردو نے پروفیسر نارنگ کو کیا دیا اس پر بحث ہو سکتی ہے لیکن پروفیسر نارنگ نے بحیثیت نقاد، دانشور اور خطیب اردو کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اس کا حساب اور شمار ناممکن ہے۔ جہاں تک پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری کا سوال ہے۔ اس مقالہ میں مختلف عنوانات اور ضمنی عنوانات کے تحت تفصیل سے دلائل اور حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پوری اردو دنیا پروفیسر نارنگ کی حیثیت اور مقام سے واقف ہے لیکن یہاں پروفیسر نارنگ کے سب سے بڑے حریف اور اردو کے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے الفاظ میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ پروفیسر نارنگ ادب کا مطالعہ غیر مشروط ذہن سے کرتے

ہیں۔ ادب سے یہ تقاضا نہیں کرتے وہ انہیں کے متقدات اور تصورات کی ترجمانی کرے۔ پروفیسر نارنگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادب اپنی جگہ خود ایک سچائی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ سچائی فلسفیانہ یا اخلاقی نظام سے ہر جگہ اور ہر طرح ہم آہنگ ہو۔ جسے نقاد خود مانتا اور قبول کرتا ہے ادب کے ساتھ ان کا PASSIONATE COMMITMENT یعنی انتہائی سچا گہرا اور بے لوث لگاؤ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال ہوں یا غالب میر و انیس ہوں یا آج کا کوئی نوجوان شاعر یا افسانہ نگار پروفیسر نارنگ ان سب کا مطالعہ یکساں خلوص و یقین کے ساتھ اور ذہن کی یکساں آزادی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ تنقید کرتے ہوئے اپنے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھتے ہیں اسی لیے ان کی تحریروں میں صرف زبان و ادب کی محبت ہی نہیں اپنے ملک، انسان اور انسانیت سے بے پناہ عشق بھی نظر آتا ہے اردو شعر و ادب کو کلاسیکی روایات کی تعمیری قدروں اور جدید اور مابعد جدید لسانی اور ادبی تصورات کو اپنی زمین اور مٹی کے تقاضوں کے مطابق اپنانے اور ادب کو زندہ متحرک اور سرسبز و زرخیز بنائے رکھنے کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جو جد و جہد کی ہے اس کے نتائج اردو دنیا

سے پرانی اور نئی بستیوں کے تخلیقی و تنقیدی ادب میں صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری اردو شعر و ادب کو صحیح تعمیری اور روشن خیال راستوں کی نشاندہی کرنے والا ایک سمت نما ہے جس کے طفیل اردو میں تحقیق و تنقید اور دانشوری صحیح خطوط پر اپنا سفر جاری رکھ سکتی ہے۔

کتابیات

نمبر شمار	مصنف/مرتب	کتاب	ناشر	سن اشاعت
۱-	آغا، ڈاکٹر وزیر	اردو شاعری کا مزاج	کراون پبلشرز اردو بازار دہلی	—
۲-	احمد ڈاکٹر ندیم	ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت	جامعہ نگر نئی دہلی	۲۰۰۲ء
۳-	انصاری، اسلوب احمد	غالب جدید تنقیدی تناظرات	غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی	۲۰۰۴ء
۴-	اختر، ڈاکٹر سلیم	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک	کتاب دنیا دہلی	۲۰۰۳ء
۵	انجم، ڈاکٹر شہزاد	دیدہ ور نقاد گوپی چند نارنگ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۴ء
۶-	اعظمی، خلیل الرحمان	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۲ء
۷-	بیگم ڈاکٹر تہمیدہ	اردو مثنوی کا مطالعہ اور تدریس	لاہوتی پرنٹ ایڈ جامعہ مسجد دہلی	۱۹۹۳ء
۸-	بریلوی، ڈاکٹر عبادت	اردو تنقید نگاری	اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۹۳ء
۹-	پروفیسر نذیر احمد	الطاف حسین حالی: تحقیقی و تنقیدی جائزے	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	۲۰۰۲ء

۱۰۔	جعفری، علی سردار	ترقی پسند تحریک کی نصف صدی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۸۷ء
۱۱۔	جین، ڈاکٹر گیان چند	اردو مثنویاں شمالی ہند میں	ترقی انجمن اردو ہند دہلی	۱۹۸۷ء
۱۲۔	جالبی، ڈاکٹر جمیل	تاریخ اردو ادب	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۷۷ء
۱۳۔	خان، ارشاد علی	جدید اصول تنقید	کتابی دنیا، دہلی	۲۰۰۵ء
۱۴۔	زیدی ڈاکٹر خوشحال	میر تقی میر۔ شخصیت اور فن	بزم خضر راہ، جامعہ نگر دہلی	۱۹۹۵ء
۱۵۔	سحر، ڈاکٹر ابو محمد	ادبی تحقیق و تنقید	مکتبہ ادب ۳۹، بھوپال	۲۰۰۳ء
۱۶۔	سدید ڈاکٹر انور	اردو ادب کی تحریکیں ابتدا سے ۱۹۷۵ء تک	کتاب دنیا دہلی	۲۰۰۴ء
۱۷۔	سرور، آل احمد	اردو تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۹ء
۱۸۔	سید طارق	اسلوب اور اسلوبیات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۹۶ء
۱۹۔	عتیق اللہ	ترجیحات	۲۲ غالب اپارٹمنٹس، دہلی	—
۲۰۔	فاروقی، شمس الرحمٰن	شعر شور انگیز	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۹۱ء
۲۱۔	فاروقی، شمس الرحمٰن	تنقیدی افکار	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی	۲۰۰۴ء
۲۲۔	قاسمی ابوالکلام	مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۲ء

۲۳-	قمر رئیس/ عالمی رہاشور	ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۸۷ء
۲۴-	نقوی نورالحسن	فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۵ء
۲۵-	نارنگ، گوپی چند	اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی	۲۰۰۲ء
۲۶-	ایضاً	ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں	ایضاً	۲۰۰۱ء
۲۷-	ایضاً	اردو شاعری اور ہندوستانی تحریک آزادی	-	-
۲۸-	ایضاً	بیسویں صدی میں اردو ادب	ساہتیہ اکادمی	۲۰۰۲ء
۲۹-	ایضاً	اردو افسانہ روایت اور مسائل	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۰ء
۳۰-	ایضاً	ادبی تنقید اور اسلوبیات	ایضاً	۱۹۸۹ء
۳۱-	ایضاً	نیا اردو افسانہ: انتخاب، تجزیے اور مباحث	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۸۸ء
۳۲-	ایضاً	انیس شناسی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۰ء
۳۳-	ایضاً	سانحہ کربلا بطور ایک شعری استعارہ	ایضاً	۱۹۸۶ء
۳۴-	ایضاً	ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت	ایڈشاٹ پبلشرز ممبئی	۲۰۰۴ء

۳۵۔ نارنگ، گوپی چند	اطلاقی تنقید نئے تناظر	ساہتیہ اکادمی	۲۰۰۳ء
۳۶۔ ایضاً	ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۴ء
۳۷۔ ایضاً	اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۹۸ء
۳۸۔ ایضاً	جدیدیت کے بعد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۲۰۰۵ء
۳۹۔ ہرگانوی، مناظر عاشق	گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی	ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی	۱۹۹۵ء
۴۰۔ ایضاً	تناسب	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۹۰ء

رسائل وجرائد

۱۔ آجکل، نئی دہلی	ابرار رحمانی	فائیل	
۲۔ ادبی دنیا	مرتبہ عبداللہ قریشی لاہور		۱۹۶۷ء
۳۔ انشاء۔ (گوپی چند نارنگ نمبر)	ف، س، اعجاز		۲۰۰۴ء

۴۔	ایوان اردو	پروفیسر قمر رئیس، مرغوب حیدری باری	فائیل
۵۔	بازیافت	شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی	۱۹۸۵ء
۶۔	بازیافت	ایضاً	۱۹۹۷ء
۷۔	بازیافت	ایضاً	۲۰۰۲ء
۸۔	بازیافت	ایضاً	۱۹۸۸ء
۹۔	بازیافت	ایضاً	۲۰۰۱ء
۱۰۔	بازیافت	ایضاً	۲۰۰۴ء
۱۱۔	بازیافت	ایضاً	۱۹۹۹ء